اٹکھیلیاں

ذوالفقار علی احسن

اٹکھیلیاں

ذوالفقار علی احسن

حق پبلی کیشنز
2-A، سید پلازہ، چیٹرجی روڈ، اُردو بازار،
لاہور 042-7220631

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

یا اللہ! تیرا شکر ہے

''رحمتیں، برکتیں، وسعتیں''

ناشر:۔ عدیل حق، محمد اجمل

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	:	انکھیلیاں
مصنف	:	ذوالفقار علی احسن
بار اوّل	:	۲۰۰۲ء
بار دوّم	:	۲۰۰۸ء
پروڈکشن منیجر	:	محمد سلیم
مارکیٹنگ	:	بشارت صدیقی
لیگل ایڈوائزر	:	عامر وہاب اعوان (ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ)
مطبع	:	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
قیمت	:	[redacted]وپے

اورینٹل کالج

کے نام

سرد تھا موسم، ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

ترتیب

	ذوالفقار کی انگھیلیاں	ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری	9
	اعترافِ جُرم	ذوالفقار علی احسن	15
1	اورینٹل نامہ		19
2	شادی خانہ بربادی		27
3	بیمارستان		32
4	”رنج لیڈر کو بہت ہیں“		39
5	”براتِ عاشقاں۔۔۔“		44
6	”خریدتے ہو جو اب راکھ“		54
7	لاٹھی چارج		60

8	''اشتہاری'' ٹی وی	65
9	پینڈو پروڈکشن	79
10	کنوارے بے روزگار	83
11	لوکل بس سے کالج تک	88
12	کیا یہی پیار ہے؟	95
13	اولڈ پیپل نیو ہاؤس	101
14	مُک مُکا	108
15	''ہو جائے گا''	113
16	ایئرپورٹ	119
17	Bed Tea	125

ذوالفقار کی اٹکھیلیاں

''اٹکھیلیاں'' کے مصنف ذوالفقار علی احسن کے ساتھ میرے تعلقِ خاطر کے ایک سے زیادہ حوالے ہیں۔ سب سے دیرینہ حوالہ یہ ہے کہ مجھے اس کے بچپن کے زمانے میں کوئی ڈیڑھ برس تک گورنمنٹ کالج، گوجرہ میں اس کے والدِ مکرم پروفیسر محمد اسلم پروانہ کی رفاقت کا موقع میسر رہا۔ اس ناتے سے میں اس کا چچا ہوں۔ جہاں تک اسلم بھائی کا تعلق ہے، مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کی شمع کون تھی۔ البتہ میں اپنے بھتیجے کے بارے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ولی کے بے شمار یتیم تھے، اسی طرح تادمِ تحریر اس کی بھی لاتعداد شمعیں ہیں۔ اگر ان میں کسی طرح علامہ اقبال کی دعا کے مصداق علم کی شمع بھی شامل ہو جائے تو گنتی میں یقیناً ایک کا اضافہ ہو سکتا ہے اور میں اس امکان کو رد کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی، ذوالفقار کے ساتھ میرے تعلقِ خاطر کی، جس کا براہِ راست حوالہ یہ ہے کہ موصوف میرا شاگردِ عزیز ہے۔ الحمدللہ، یوں تو کم و بیش سب

کے سب طلبہ محبت سے زیادہ عزت اور عزت سے زیادہ محبت کرتے ہیں، تاہم میں ذوالفقار کا شمار اپنی تدریسی زندگی کے دو عشروں میں میسر آنے والے ان معدودے چند طلبہ میں کر سکتا ہوں جو اپنے اخلاص کی فراوانی کے باعث پروانہ وار مجھ پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔ میں ان شاگردوں کو اپنا نہایت قیمتی اثاثہ سمجھتا ہوں۔ بلاشبہ یہ کسی بھی اُستاد کے لیے قابلِ رشک ہو سکتے ہیں۔

ذوالفقار نے حال ہی میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم۔ اے (اردو) سالِ دوم کا امتحان دیا ہے اور نتیجے کے انتظار میں ہے۔ اورینٹل کالج میں اپنے دوسالہ قیام کے دوران میں یہ سیاسی سرگرمیوں سے بالکل لاتعلق رہتے ہوئے اکثر ہم نصابی سرگرمیوں میں شریک اور بعض غیر نصابی سرگرمیوں میں ملوث رہا ہے۔ گذشتہ سال یہ طلبہ کے سالانہ علمی و ادبی مجلّہ ''شرق'' کی مجلسِ ادارت میں بھی شامل رہا ہے اور اس نے میری نگرانی میں ''اردو سفرنامے میں طنز و مزاح کے عناصر۔۔۔ قیامِ پاکستان کے بعد'' کے زیرِ عنوان تحقیقی و تنقیدی مقالہ بھی قلمبند کیا ہے۔ دورانِ تعلیم یہ شہر کے ادبی حلقوں میں بھی جاتا رہا ہے اور کالج کی ''انجمن اردو'' کے ہفتہ وار جلسوں میں اس نے خاص طور سے شاعر اور نثر نگار کی حیثیت سے بارہا شرکت کی ہے۔ اس کی متعدد منظوم و منثور تحریریں کالج کے مجلّہ ''شرق'' یونیورسٹی میگزین ''محور'' اور بعض ادبی جریدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ اس کی سعادت مندی ہے کہ اس نے ہر مرحلے اور ہر سطح پر مجھ سے رائے لینا ضروری سمجھا اور پھر میرے مشورے کو سرپرستی اور راہنمائی پر محمول کیا ہے۔ اور قارئینِ محترم! اس ضمن میں آپ کو بھی میرا ممنون ہونا چاہیے کہ اگر ذوالفقار میری مشاورت کو اس قدر اہمیت نہ دیتا تو آج آپ کو اس کی شگفتہ نثر کی

بجائے بے نمک شاعری پڑھنا پڑتی۔ وہ تو اچھا ہوا کہ یہ بہت جلد میری بات مان گیا کہ اس کی شاعری کو اصلاح کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل میں نے ابتداء ہی میں اس کی پیشانی پر لکھی ہوئی یہ تحریر پڑھ لی تھی کہ اس کا تخلیقی جوہر اظہار کے لیے جس عرض کی تلاش میں ہے وہ شاعری نہیں، نثر ہے اور نثر بھی مزاحیہ۔ یہی وہ پیرایۂ اظہار ہے جس میں اس کی فطری صلاحیت نہ صرف یہ کہ کھل کر ظاہر ہو سکتی ہے بلکہ اس میں مطالعہ و مشاہدہ میں اضافہ ہونے کے باعث وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید نکھار پیدا ہونے کے امکانات بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ اورینٹل کالج کی فضا میں موجود تربیت کے مواقع سے ویسا بھرپور فائدہ ہرگز نہ اُٹھا پاتا جیسا اس نے اُٹھالیا ہے۔ اسی لیے میں اس کے حال کے آئینے میں اس کے درخشاں مستقبل کی جھلک دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہی نہیں یقین ہے کہ یہ اورینٹل کالج کے پروردہ اُن نامور نثر نگاروں کے تسلسل کا حصہ بنے گا جن کی شناخت کا بنیادی حوالہ مزاح ہے۔ میری یہ پیش بینی ذوالفقار کے ساتھ محض میری جذباتی وابستگی اور اس کے بارے میں صرف میری نیک تمناؤں پر ہی مبنی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اس کے تخلیقی جوہر کی توانائی اور اکتساب کی استعداد ہے۔ میں نے اسی بنیاد پر چند سال پیشتر ''قلمی دشمنی'' کے خالق عزیزم اشفاق احمد ورک کو متعارف کراتے ہوئے اسی طرح کی پیش گوئی کی تھی اور آج یہ عالم ہے کہ ''بے برکتی'' کا شکار بہت سے نوجوان مزاح نگار اس کی مقبولیت پر رشک کرتے ہیں۔ انشاء اللہ ذوالفقار بھی رفتہ رفتہ قابلِ رشک مقام تک پہنچے گا۔ دراصل اس میں ''اشیاء کا ظریفانہ پہلو دیکھنے'' کا فطری ملکہ موجود ہے۔ دی نیو کیکسٹن انسائیکلوپیڈیا (The New Caxton Encyclopedia) میں مزاح کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے۔ اور

اسی طرح دی انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا (The Encyclopedia Britanica) میں جو یہ مرقوم ہے کہ ''مزاح ایک قسم کا عمل ہے جو ردِّ عمل کے طور پر ہنسی کے اُبھارنے کا رجحان رکھتا ہے''، ذوالفقار کی اکثر تحریروں پر صادق آتا ہے۔ اس کی اٹکھیلیاں گدگدی کرتے ہوئے ہنسی کو تحریک دیتی ہیں اور ہم ہنسنے پر مجبور سے ہو جاتے ہیں۔ عصرِ حاضر میں، کہ جب مزاح اور مزاح نگاروں کی لُوٹ سیل لگی ہوئی ہے، اکثر لکھنے والوں کی مزاح کے نام پر لکھی ہوئی تحریروں میں ہنسی کے مواقع تلاش کرنا کسی گنجے کے سر پر بال ڈھونڈنے کے مترادف ہے۔ بلکہ اکثر مزاحیہ تحریریں پڑھتے ہوئے ہنسی تو درکنار، رونا نہیں آتا۔ ایسے میں ذوالفقار کی تحریریں پڑھتے ہوئے کھل کر ہنسی آتی ہے جو اس کے حق میں نیک فال ہے۔

''اٹکھیلیاں'' میں ذوالفقار کے ''اعترافِ جُرم'' کے علاوہ کل سترہ کھٹی میٹھی تحریریں شامل ہیں۔ ان میں ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرنے کے لیے زیادہ تر لفظی چٹکلے بازی کو کام میں لایا گیا ہے۔ لفظوں سے کھیلنا ذوالفقار کا دلچسپ مشغلہ اور اس کی مزاح نگاری کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ اس ضمن میں یہ کبھی ترتیبِ الفاظ میں تقدیم وتاخیر اور اُلٹ پھیر سے ہنسی کو تحریک دیتا ہے اور کبھی اس مقصد کے لیے تکرار، تقلیب اور تجنیس کو بروئے کار لاتا ہے۔ کہیں کہیں اس کے ہاں فقرے کسنے اور جگت لگانے کا انداز بھی ملتا ہے جو آج کل کے اسٹیج ڈراموں کی یاد دلاتا ہے، تاہم ذوالفقار کے ہاں ابتذال اور لذت اندوزی کا بازاری انداز بالکل دکھائی نہیں دیتا۔ یہ درست ہے کہ اس نے مزاح کے ایک بہت بڑے حربے ''تحریف'' (Parody) سے بہت کم کام لیا ہے اور اس کے ہاں خیال کی سطح پر تو پھر کسی حد تک اس کا رنگ مل جاتا ہے، الفاظ کی سطح پر

شاذ و نادر ہی اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر اس کے باوجود ذوالفقار کا مزاح بنیادی طور پر لسانی مزاح کی ذیل میں آتا ہے۔ ابھی اس کی زبان کو منجھنا ہے۔ جُوں جُوں زبان پر اس کی گرفت بڑھتی جائے گی، یہ تحریف کی طرف بھی آتا چلا جائے گا۔ اشعار کی تحریف خاص طور سے ریاضت کا تقاضا کرتی ہے اور ذوالفقار ریاضت کے راستے پر گامزن ہو چکا ہے۔

ہمارے گردوپیش میں، زندگی کے عام اور متنوع کرداروں کے توسط سے چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ذوالفقار ان واقعات کے ظریفانہ پہلوؤں کی متحرک تصویر کشی کرتے ہوئے کرداروں کے مکالمے قلمبند کر دیتا ہے۔ ایسا کرتے ہوئے یہ اپنے تخیل کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ چنانچہ اس کے پیش کردہ کردار، واقعات اور مکالمے حقیقی ہی نہیں، فرضی اور خود ساختہ بھی ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر یہ منتخب لطیفوں سے بھی اپنی تحریروں کو سجاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ لطیفے گھڑ بھی لیتا ہے۔ یوں اس کی تحریریں واقعاتی اور لسانی مزاح کا امتزاجی نمونہ بن جاتی ہیں۔

ذوالفقار کی تحریروں میں مزاح کا رجحان طنز پر غالب دکھائی دیتا ہے۔ شاید یہ اس کی عمر کا تقاضا ہے۔ ظاہر ہے کہ نوجوانی میں انسان کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور ان ترجیحات میں اجتماعی اصلاح کا مقصد تو دُور کی بات ہے، اپنی اصلاح کا پہلو بھی شاذ و نادر ہی جگہ بنا پاتا ہے۔ اس عمر میں تو اپنی ذات کے گرد گھومتے ہوئے شوخ رومانوی رنگوں کے فانوس نما ہیولے ہی باعثِ کشش ہوا کرتے ہیں۔ ذوالفقار بھی انھی میں جاذبیت محسوس کرتا ہے۔ ان کے بارے میں اس کا زاویۂ نگاہ ظریفانہ ہے۔ اس ضمن میں اس کی تحریریں ''اورینٹل نامہ''، ''لوکل بس سے کالج تک''، ''براتِ عاشقاں''

''نوارے بے روزگار''، ''کیا یہی پیار ہے؟'' اور ''شادی خانہ بربادی'' بطور خاص دیکھی جا سکتی ہیں۔ ذوالفقار نے بعض تحریروں مثلاً ''مُک مُکا''، ''ہو جائے گا''، ''رنج لیڈر کو بہت ہیں'' اور ''اولڈ پیپل نیو ہاؤس'' میں کئی معاشرتی بیماریوں اور اجتماعی روّیوں کو بھی موضوع بنایا ہے اور ان میں دوسری تحریروں کی نسبت طنز کا ذائقہ کچھ زیادہ ہے، تاہم غالب رجحان ان تحریروں میں بھی مزاح ہی کا ہے۔ البتہ ان تحریروں کو دیکھتے ہوئے یہ قیاس ضرور کیا جا سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ذوالفقار طنز نگاری کی طرف بھی متوجہ ہوگا اور جن بے اعتدالیوں کو دیکھ کر اسے اب ہنسی آتی ہے، انھیں معاشرتی زندگی سے کھرچ ڈالنے کی خواہش میں بھی پختگی آتی جائے گی۔ ذوالفقار سیاست کے عالمی تناظر سے بھی کسی نہ کسی حد تک باخبر ہے۔ ''کریدتے ہو جواب راکھ'' اور ''ایئر پورٹ'' اس امر کے گواہ ہیں۔ اس میں ملّی احساسِ دردمندی نے جذباتی ہنسی کا روپ دھارا ہے جو کچھ عرصے کے بعد گلوبل ویلیج کے چودھریوں کے خلاف زہر خند کی صورت میں ڈھل سکتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی ''اٹکھیلیاں'' میں ذوالفقار کے تیور حوصلہ افزا ہیں۔ میں اسے عہدِ حاضر کے نوجوان مزاح نگاروں میں ایک خوشگوار اضافہ گردانتے ہوئے اس کی کتاب کا کُھلے دِل سے استقبال کرتا ہوں۔

مؤرخہ: ۲۸۔جنوری ۲۰۰۲ء

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری
اورینٹل کالج، جامعہ پنجاب،
لاہور۔

اِعترافِ جُرم

اس سے پہلے کہ مجھے پولیس پکڑ لے اور مجھ پر من گھڑت فردِ جرم عائد کر دے میں اعترافِ گناہ کر رہا ہوں۔ میں ذوالفقار علی احسن بقائمی ہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مبنی یہ کتاب میرے قلم سے نکلی ہے۔

میں نہایت شریف اور معصوم طالب علم ہوں اور میرا تعلق دہشت گردوں کے کسی گروہ یا کسی ادبی حلقے سے نہیں ہے اور نہ میرے پاس کوئی ''ناجائز اسلحہ'' یا ہمنوا نقادوں کا کوئی ٹروپ ہی ہے۔ کمزور دِل ہوں، ڈرتا ہوں۔ امریکہ کو اسامہ بن لادن پکڑنے کی جلدی ہے اور ہمیں پکڑوانے کی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس والے میرے کھاتے میں کوئی کلاشنکوف ڈال کر اور مجھے اس کا ساتھی بنا کر چند ڈالر میں امریکہ سمگل کر دیں۔ اس لیے اپنا صفایا ہونے سے پہلے صفائی دے رہا ہوں۔

مشہور تو اب مجھے ہو ہی جانا ہے اور پھر مجھے دوسرے سکہ بند ادیبوں کی طرح بار بار اس سوال کا سامنا بھی کرنا ہے کہ آپ کس سے متاثر ہیں؟

اس سلسلے میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فی الحال تو میں صرف ''امریکن سنڈی'' سے متاثر ہوا ہوں کیونکہ گھر والوں نے جو کپاس کاشت کی تھی وہ اس کی نذر ہوگئی ہے اور مجھے جیب خرچ کے لالے پڑ گئے ہیں۔

ویسے میں ڈاکٹر یونس بٹ کو اس لحاظ سے اچھا مزاح نگار سمجھتا ہوں کہ کبھی کبھی اُن کے ہاں بھی ''میرے فن'' کی جھلک مل جاتی ہے۔ جناب عطاء الحق قاسمی سے تو میں باقاعدہ متاثر ہوں اور ان کا ممنون بھی ہوں کہ انہوں نے فلیپ کی صورت میں میری حوصلہ افزائی کی ہے۔

جب سے اُردو کی وادیٔ پرخار میں قدم رکھا ہے سٹیفن لیکاک کا مزاح کے بارے میں فرمایا ہوا یہ ارشاد:

''مزاح زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور
کا نام ہے جس میں فنکارانہ اظہار ہو جائے۔''

کسی طرح سے پیچھا نہیں چھوڑ رہا اور جس نسل سے میرا تعلق ہے زندگی اس کے لیے اتنی ناہموار اور کٹھن ہو چکی ہے کہ ہمدردانہ شعور رکھنے والا ہر شخص چاہے وہ اس کا فنکارانہ اظہار کرنے کی قدرت رکھتا ہے یا نہیں ایک عجیب سی بے بسی، گھٹن اور دِل گرفتگی کا شکار ہو چکا ہے۔ معاشرتی، سماجی اور اقتصادی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ ہماری حکومتوں اور اس کے اداروں کی زبوں حالی نے مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اہلِ وطن کی اس روش کے بارے میں اس طرح سے لکھوں کہ کم سے کم لوگ آزردہ ہوں۔ میری تحریر میں آپ کو کہیں کہیں طنز کے نشتر کی چبھن محسوس ہوگی۔ پڑھتے وقت فرسٹ ایڈ بکس (امریکی امپورٹڈ) ساتھ رکھیئے گا۔ البتہ جہاں کہیں آپ کو پھیکا پن محسوس

ہو گھبرایئے گا نہیں وہ صرف شوگر کے مریضوں کے بارے میں ''ہمدردانہ شعور'' کی وجہ سے ہے۔

یہ چند نمکین مضامین جنہیں لکھتے ہوئے ہر قدم پر بقول جگر مرادآبادی یہ احساس رہا۔

ع کتنا حسیں گناہ کیئے جا رہا ہوں میں

ان کے لکھنے میں میرے ساتھ میرے والدین، اساتذہ (خصوصاً پروفیسر محمد الیاس ساقی اور پروفیسر نثار احمد علوی) اور دوستوں (خصوصاً مرزا محمد شفیق الرحمٰن اور شاہد بشیر) کی دُعائیں ہر قدم پر میرے شاملِ حال رہیں۔ جہاں کہیں آپ کو ان مضامین میں تاثیر کی کمی نظر آئے اُسے میری تحریر کی خامی مت خیال کیجیے گا بلکہ یہ سمجھیئے گا کہ ''دُعا کی بے اثری رہی۔''

میری ادبی پرداخت میں میرے والدِ محترم پروفیسر محمد اسلم پروانہ کا بہت حصہ ہے جن کی دعاؤں، تربیت اور فیضِ صحبت نے میرے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔

اورینٹل کالج میں میرے محترم و مکرم اُستاد ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری جن کا شاگرد ہونے پر بجا طور پر مجھے فخر ہے، میں نے اُن کی زبان سے بارہا مزاح کی پھلجھڑیاں بکھرتے دیکھیں اور اپنے دامانِ تار تار میں ایک ایک پنکھڑی کو سمیٹتا چلا گیا۔ طنز و مزاح کے اس گلدستے میں جتنے بھی پھول اور کلیاں ہیں، ان میں بھی اُن کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

اس مادرِ علمی میں اُستادِ محترم ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر جمیل احمد خان اور ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری جیسی نابغہ شخصیات میرے لیے ہمیشہ

روشنی کا مینار ثابت ہوئیں، جن کے لیے میرے دِل میں ہمیشہ ادب واحترام کے پھول کھلتے رہیں گے۔

میں میڈم عارفہ شہزاد کا بھی تہہِ دِل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت میرے ان مضامین کو پڑھنے اور مجھے گراں قدر مشوروں سے نوازنے میں صرف کیا۔

روزِ اوّل سے شاگرد اپنے اساتذہ کا احترام کرتے آئے ہیں۔ علامہ محمد اقبال نے انگریز سرکار کا دیا ہوا ''سر'' کا خطاب اُس وقت تک قبول نہ کیا جب تک اُن کے کہنے پر ان کے محترم استاد مولوی میر حسن کو شمس العلماء کا خطاب نہ دے دیا گیا۔

اپنے اساتذہ کا احترام میرے دِل میں بھی ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس لیے میں نے مصمم ارادہ کیا ہوا ہے کہ اگر میرے اس اعترافِ جرم کے بعد پولیس نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میں اُس وقت تک پکڑا نہیں جاؤں گا (چاہے مجھے اشتہاری ہونا پڑے) جب تک وہ میرے سارے محترم اساتذہ کو پابندِ سلاسل نہ کر دیں۔

آخر میں اہلِ وطن سے اتنی گزارش ہے کہ اقتصادی بدحالی کے اس دور میں، جس میں چند حسینوں کو خطوط لکھنے کے لیے کاغذ خریدنا بھی ناممکن ہو گیا ہے، میں نے جیسے تیسے کتاب چھپوانے کا بارِ گراں اُٹھایا ہے اس لیے اس کتاب کو خرید کر پڑھیئے گا، مانگ تانگ کر مت پڑھیئے گا۔ ہاں! کسی سے رقم اُدھار مانگ کر خریدنے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی اگر آپ نے یہ کتاب خرید کر نہ پڑھی تو یہ ہمارا قومی نقصان ہوگا کیونکہ قومیں افراد سے بنتی ہیں اور میں بھی ایک فرد ہوں۔

ذوالفقار علی احسن

اوری اینٹل نامہ

ہمارے دوست نے مرے کالج سے ایم۔ اے کیا اور مجھے بھی وہیں داخلہ لینے کا مشورہ دیا لیکن میں نے جب ان سے پوچھا کہ مرے کالج میں ہوتے ہوئے آپ کسی پر ''مرے'' بھی ہیں تو ان کا جواب نفی کی صورت میں تھا۔ میں نے کہا آپ تو بالکل منکر ہی نکلے آپ کا موت پر یقین ہی نہیں۔ دُنیا فانی ہے ہر کسی نے مرنا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں نہیں۔

لہٰذا کافی سوچ بچار کے بعد میں نے یونیورسٹی اوری اینٹل کالج کے شعبہ اردو میں داخلہ لے لیا۔

کالج میں میلے کا سا سماں تھا۔ ہر کوئی ''گواچی گاں'' کی طرح اپنے ریوڑ کی تلاش میں تھا پہلے پہل ہر کوئی ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتا لیکن کچھ عرصہ بعد ہاتھ کر جاتا اور کچھ لوگ ایک دوسرے سے گلے ملتے لیکن انہوں نے بعد میں ایک دوسرے کا گلہ دبانا شروع کر دیا۔

ہماری کلاس میں لڑکیوں کی تعداد (۶۵) پینسٹھ ہے اور شاید اسی وجہ سے پینسٹھ والے حالات بنے رہتے ہیں۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ چھ کم ہیں ورنہ وہ کب کی اُدھر اور ہم اِدھر ہوتے۔ یوں کہہ لیجیے کہ اوری اینٹل کالج میں لڑکیاں اس طرح چھائی ہوئی ہیں جیسے کپاس کی فصل پر امریکن سنڈیاں لیکن کہیں کہیں ''رس چوسنے'' والے کیڑے بھی پائے جاتے ہیں۔ سٹنگ کے اعتبار سے اگرچہ سب اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہیں لیکن پھر بھی کچھ لوگ ایک دوسرے کے ''گوڈوں گٹوں'' میں بیٹھ جاتے ہیں۔

لڑکے بے چارے یہاں آ کر عجیب ذہنی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ لڑکیوں سے تعلقات بڑھانے کے شوق میں ان کے پیچھے ایسے پھرتے ہیں جیسے کسی نیک اور متقی انسان کے پیچھے شیطان۔

ان میں سے کچھ لوگ صابر ہیں جو صبر پر گزارا کرتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو دیکھا دکھائی پر اس طرح ہر ایک کا گزارہ ہو ہی جاتا ہے۔ جن کا مشغلہ صرف دیکھنا ہے وہ ایسے ہیں کہ کبھی اِس کو دیکھا کبھی اُس کو دیکھا لیکن اپنے آپ کو نہ دیکھا۔ اس قسم کے لوگ آپ کو کالج کے آباد کونوں میں شکاریوں کی طرح پھرتے نظر آئیں گے جب آپ ان سے کوئی بات پوچھیں تو یہ پھرتے پھرتے اپنی بات سے بھی پھر جائیں گے۔

ایسے ہی کچھ لوگ آپ کو لائبریری میں بھی کثرت سے نظر آئیں گے کتابوں سے زیادہ چہرے پڑھنے والے یہ حضرات چہروں کے نقش و نگار سے پیشین گوئیاں کرتے نظر آئیں گے حالانکہ حقیقت کا سامنا کریں تو ان کا اپنا مستقبل ''جے سوریا''

کے رنگ کی طرح ہے۔

کچھ بے چارے اتنے سادہ ہیں کہ جب کسی صنفِ نازک کو دیکھتے ہیں تو بات کا پہلو بدلتے ہوئے چہرے کا رخ بھی بدل لیتے ہیں اور چہرے کی رنگت زرد ہو جاتی ہے اور دائمی مریض نظر آتے ہیں ان کو دیکھ کر لگتا ہے ان کے لیے کسی دیسی حکیم کا اہتمام کرنا پڑے گا۔ بہت سے لوگ یونیورسٹی میں آتے ہوئے اپنے ذہن میں شیشے کا محل تعمیر کر کے آتے ہیں لیکن بعد میں اس کی وہی حالت ہوتی ہے جو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون کی۔ اس قسم کے لوگ یہاں عشق و محبت کی لازوال داستان بنانے کے چکر میں ہوتے ہیں اور دو سال بعد مایوس ہو کر یہ گنگناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ع جو پیار کر گئے وہ لوگ اور تھے

کچھ تو بات کرنا فرض سمجھتے ہیں چاہے بات بنے یا نہ بنے بات بن گئی تو باتوں کے بتنگڑ بنانا شروع کر دیئے اور دوسری صورت میں اس ''چپ شاہ'' پہلوان کی طرح جس سے کسی نے پوچھا پہلوان جی ساری عمر آپ نے پہلوانی کی مگر چوٹ ایک بھی نہیں آئی مسکراتے ہوئے پہلوان نے جواب دیا بیٹا ساری عمر ایک ہی طریقہ رہا کہ اگر حریف کمزور ہوتا تو گھل لیتے اور اگر طاقتور ہوتا تو پھر گھل مل جاتے تھے۔

کچھ لوگ بات کرتے ہوئے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے یوں نظر آئیں گے جیسے خطِ لوح پر کچھ لکھا ہوا مٹا رہے ہوں حالانکہ تجسّس کو ختم کرنے کے لیے مزید قریب سے دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ وہ تو پسینے کے فواروں کو بند کرنے کی ناکام کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ کہیں اگر دو متضاد افراد آپس میں باتیں کرتے ہوئے نظر آئیں تو دیکھنے والے تمام لوگ فلمی ڈائیلاگ اپنے ذہن میں لے آتے ہیں حالانکہ

وہ بیچارے تو فوٹو سٹیٹ کے پیسوں پر جھگڑا کر رہے ہوتے ہیں اور بعض کا موضوع گزشتہ تقریب میں کھائے گئے نان چرغہ کے سوا کچھ نہیں ہوتا جو کہ انہوں نے نان سٹاپ کھایا ہوتا ہے۔ ان میں ادبی ذوق اور سمجھ بوجھ ماشاءاللہ اتنی زیادہ ہے کہ اگر کوئی کسی سے کہے میں تمہاری آنکھوں میں اُترنا چاہتا ہوں تو جواب ملتا ہے میری آنکھوں میں پہلے ہی موتیا اُترا ہوا ہے۔

کالج کی حدود میں عموماً ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی جوڑا کالج کے تاریخی درختوں کی اوٹ میں رومانٹک گفتگو میں مصروف ہے اور اس ''حسینہ'' کا ایک فدائی انہیں کالج کی سیڑھیوں پر کھڑا آنکھوں سے جھانک رہا ہوتا ہے جب کہ ایک اور عاشق ڈگمگاتا ہوا اس درخت کے پاس سے دِل پر ہاتھ رکھ کر گزرتا ہے تو سامنے اسے اپنا ایک اور رقیب دریافت ہو جاتا ہے۔ ایسی صورتِ حال دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر اس کے لرزتے ہونٹوں پر مچلنے لگتا ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی ''تیسرا'' نہیں ہوتا

لباس کے حوالے سے بھی اوری اینٹل کالج میں خاص قسم کا ارتقا پایا جاتا ہے یعنی ایک دِن یہ شلوار قمیض پہنتے ہیں تو دوسرے دِن قمیض شلوار اور پھر ان کی تکرار سے تنگ آ کر پینٹ کی طرف رجوع کرتے ہیں چونکہ پینٹ زندگی میں کم ہی پہنی ہوتی ہے اس لیے کھلی اور ڈھیلی ڈھالی سی پینٹ لے آتے ہیں جو پینٹ کم اور ٹینٹ زیادہ لگتی ہے اور اس پر ستم یہ کہ اس لباس میں پھر یہ اپنے آپ کو شعبہ کا چیئرمین سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ نظروں سے یہ ''چورمین'' ہی لگتے ہیں۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات ہیں مثلاً حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ اردو پر پنجابی کے زیادہ اثرات ہیں لیکن کالج کے کچھ موجودہ محققین کا خیال ہے کہ اردو پر ''پنجابی'' کے ہی نہیں بلکہ ''کشمیریات'' کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ کالج کے شعبہ کشمیریات سے دوسرے شعبہ جات کو خاصی ہمدردی ہے کیوں نہ ہو! وہ نہ صرف مظلوم ہیں بلکہ غریب بھی اپنی معاشی حالت کو سہارا دینے کے لیے ''کشمیری دال چاول'' کا کاروبار کالج کے عین سامنے وسیع پیمانے پر شروع کیا ہوا ہے حالانکہ ان کی اپنی دال کم ہی گلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شعبہ کشمیریات اور پنجابی کے سٹوڈنٹس اتنے متحرک ہیں کہ صبح کالج کھلنے سے پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں اور دوسرے تمام شعبہ جات کے لوگوں کا اس طرح استقبال کرتے ہیں جیسے شادی کے دِن دلہن والے بارات کا۔ یہ کالج سے اُس وقت رخصت ہوتے ہیں جب بقول شاعر:

ع کوئی ''صورت'' نظر نہیں آتی

ان کے لباس اور چال ڈھال کو دیکھ کر اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ طالب علم نہیں بلکہ کسی گاؤں کے چودھری ہیں جو اپنی سابقہ زمینوں کا قبضہ چھڑانے آئے ہیں۔ یہ اتنے ذہین ہیں کہ سب کچھ جانتے ہیں سوائے اپنے مضمون کے۔ اس طرح یہ کلاسیں پڑھتے کم ہیں اور دیکھتے زیادہ ہیں۔

زبانوں کے اس کالج میں زبان و بیان، تلفظ اور تذکیر و تانیث کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی لڑکا پریشان ہو کر اساتذہ سے رجوع کرے تو اس کو حوصلہ دیا جاتا ہے اور اگر لڑکی اپنا مدعا بیان کرے تو تسلی سے مستفید ہوتی ہے۔

یہاں آ کر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ تعلیم بھی خالص نہیں رہی یعنی فیس ہم اردو پڑھنے کے لیے جمع کرواتے ہیں اور پڑھائی فارسی، عربی اور کسی حد تک انگریزی بھی جاتی ہے۔

سالِ اوّل میں پریم چند کو اتنا پڑھایا جاتا ہے کہ جماعت میں چند پریم شروع ہو جاتے ہیں۔ غالب تو ان پر بھی غالب آ جاتا ہے جو نہ مغلوب ہونے کے ارادے سے کالج میں آئے ہوتے ہیں۔ آغا حشر بھی برا حشر کر دیتا ہے اور آزاد کا کیا ذکر کریں کہ آزادی کی تو یہ صورتِ حال ہے کہ کالج کے واٹر کولر کے گلاس کو بھی بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔

کالج کے طالبِ علم اتنے غیرت مند ہیں کہ اگر استاد دورانِ لیکچر ''سوال'' کرنے کو کہیں تو کوئی بھی دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ ان میں پڑھائی کا شوق اتنا زیادہ ہے کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو الٹی پٹی پڑھاتا رہتا ہے اور پروفیسر صاحب کی غیر موجودگی میں کلاس روم میں اردو ادب کا پریکٹیکل ہوتا رہتا ہے جس کی بنیاد زیادہ تر کلاسیکی شعرا ہی ہوتے ہیں۔ ویسے تو یہ شاگرد ہوتے ہوئے بھی اُستاد ہیں مگر شاید مستقبل میں بہت بڑے اُستاد ہوں گے۔

لاہور کا خاص مزاج جو کہ کھانے پینے سے متعلق ہے۔ یہاں پر کھل کر سامنے آتا ہے لڑکیاں جتنی فیس یونیورسٹی میں جمع کرواتی ہیں اس سے چار گنا کھانے پینے یعنی کشمیری دال چاول، اچار پٹھورے، سونف سپاری اور نان حلیم وغیرہ پر خرچ کر دیتی ہیں لیکن ان کی طبیعت میں حلیمی پھر بھی نہیں آتی۔ ان کے والدین یہ سب اخراجات برداشت کرتے ہیں اور یہ سوچ کر دِل کو تسلی دیتے ہیں کہ تعلیم بہت مہنگی ہو گئی

ہے۔ کالج کے برآمدے اکثر اوقات دعوتِ ولیمہ کا منظر پیش کرتے ہیں اور آخر کار ان پر صدرِ شعبہ کی طرف سے ''آوارہ خرامی'' کا الزام بھی عائد ہوتا ہے۔

خوبصورتی کے حوالے سے اکیسویں صدی کے دھوکہ بازوں کا کیا ذکر دُور سے دیکھو تو دِل میں اُتر جاتے ہیں اور قریب سے دیکھو تو دِل سے اُتر جاتے ہیں۔

ع ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

حقیقت میں یہ سب دھوکہ ہے سراب ہے بالکل اسی طرح جیسے ''انارکلی'' میں کسی کڑھائی کی دکان پر جائیں تو دور سے ایسے لگتا ہے کہ ''سری دیوی'' ہماری طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہے لیکن جب قریب سے دیکھا جائے تو سری ہی رہ جاتی ہے اور دیوی نا جانے کہاں گم ہو جاتی ہے۔

کالج انتظامیہ کی طرف سے طلبہ کو کافی سہولیات میسر کی گئی ہیں۔ فارغ اوقات میں طالبات لان میں اور طلبہ کالج کونوں میں زبردستی کی کرسیوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ان کونوں پر بیٹھے یہ بھنورے پولیس والوں کی طرح ہر ایک کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

بظاہر موسم کی شدت سے اور خصوصاً کسی ''اور وجہ'' سے کالج کے کاریڈور ہمہ وقت لوگوں سے پُر رہتے ہیں اگر رش کی یہی صورتِ حال رہی تو کالج انتظامیہ کو اسے ون وے کرنا پڑے گا۔

صحت کے حوالے سے بعض لوگوں کو دیکھ کر یہ خدشہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں خدانخواستہ قحط سالی ہے اور کچھ کو دیکھ کر یہ حوصلہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں ابھی خالص دیسی گھی وافر مقدار میں موجود ہے۔

کالج کے کیفے ٹیریا کو اگر جائے بیکٹیریا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہاں پر بھی کچھ حضرات اس طرح جمگھٹا لگا کر بیٹھے ہوتے ہیں کہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا گماں ہوتا ہے۔ نئی نسل کے یہ عشاق عشق میں ناکام ہو کر منہ سے سگریٹ کا دھواں ایسے نکالتے ہیں جیسے پرانے رکشے کے سلنسر سے دھواں۔ اب ان ناکام عشاق کا عشق کے بارے میں دعویٰ ہے کہ ''عشق صحت کے لیے مضر ہے'' ''وزارتِ عشق''

ان عشاق میں ہمارے ایک ایسے دوست بھی ہیں کہ انہوں نے جس لڑکی کی طرف بھی پیار بھری نگاہ سے دیکھا اس کی ہی شادی ہوگئی اور اب ان کا یقینِ کامل ہے کہ:

ع نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

سالِ دوم کے اختتام پر آٹوگراف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو بڑا ہیرو تصور کر رہا ہوتا ہے۔ ڈائریوں پر ہر کوئی اپنے آپ کو مفکر ثابت کرنے میں کوشاں ہوتا ہے۔ بچپن میں پڑھے ہوئے اقوالِ زریں بہت کام آتے ہیں۔

میرے دوست نے بتایا کہ مرے کالج میں یہ سب سہولیات میسر نہیں ہیں۔ اب اس سے پہلے کہ میں مرنے کی باتیں کرتے کرتے ''مر جاؤں'' اپنی زندگی ہی میں اس مضمون کا خاتمہ کرتا ہوں اور مرنے کا کام آپ پہ چھوڑتا ہوں۔

○○○

شادی خانہ بربادی

جب قربانی کے دِن قریب آتے ہیں تو بکروں کی ایسے ٹہل سیوا کی جاتی ہے جیسے الیکشن کے دنوں میں ووٹروں کی۔ عید سے چند روز قبل بکرے کے گلے میں ہار یوں ڈالے ہوتے ہیں جیسے حج سے واپس آ رہے ہوں مگر پاؤں میں ''پازیبیں'' دیکھ کر وہ محلّہ یاد آتا ہے کہ جہاں جانے میں کم اور نام لینے میں ہم زیادہ شرم محسوس کرتے ہیں۔ بکرا دِل ہی دِل میں بہت خوش ہوتا ہے اور یہ اس کی آخری خوشی ہوتی ہے۔

اس طرح کے حادثات سے انسانیت اکثر و بیشتر دوچار ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ بوقتِ حادثہ دو اور حادثہ کے چند ماہ بعد چار ہو جاتے ہیں اور یوں سکور بڑھتا رہتا ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم خاصے معصوم ہوا کرتے تھے۔ ایک بزرگ سے ہم نے پوچھا کہ وسیم اکرم کے کتنے رن ہیں انہوں نے فرمایا کہ وسیم اکرم کی فی

الحال صرف ایک ''رن'' ہے ہم نے عرض کی کہ شاہد آفریدی کے کتنے رن ہیں انہوں نے جواب دیا کہ اس کی کاغذوں میں کوئی ''رن'' نہیں ہے۔

پھر بھی کرکٹرز کی موج ہے بغیر ولیمہ اور منگنی کے جتنی چاہیں ''رنیں'' بنا سکتے ہیں۔

انسان خطا کا پتلا ہے مگر اپنی خطاؤں کا احساس اسی وقت ہوتا ہے۔ جب پانی سر سے گزر جاتا ہے اور ایسے مواقع پر پانی بھی سر سے ایسے گزرتا ہے جیسے غریب کے اچھے دِن گزرتے ہیں۔

شادی وہ پھل ہے جسے کھانے والا بھی پچھتاتا ہے اور نہ کھانے والا بھی، لیکن بھلائی اسی میں ہے کہ کھا کر ہی پچھتایا جائے۔ منگنی ہوتے ہی انسان کا دماغ خواہ مخواہ خراب ہو جاتا ہے ایسے لگتا ہے جیسے منگنی نہ ہوئی ہو بلکہ امریکہ کا صدر بن گیا ہو حالانکہ ساری دُنیا کو علم ہے کہ امریکی صدر کو بھی اپنی قوم سے معافی مانگنا پڑی۔

منگنی کے بعد اکثر خواب میں دوشیزائیں نظر آتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ساس کا ''بھرپور'' چہرہ بھی نظر آتا ہے ساس انسان کی بربادی کی ''اساس'' ہوا کرتی ہے۔

لڑکے کے والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ بیٹے کی شادی خوب دھوم دھام سے ہو بے شک شادی کے بعد پاکستان کی طرح ڈیفالٹر ہی کیوں نہ قرار دیئے جائیں اور والدین کی یہ بھی تمنا ہوتی ہے کہ بیٹا وہ تمام کام ''تمام'' کر دے جو اُن سے اُن کے عمری تقاضے کی وجہ سے نہیں ہو پا رہے ہیں۔

ولیمے پر ایسے ایسے کھانے بنائے جاتے ہیں جن سے صرف اور صرف

ولیموں پر ہی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ولیمے پر لوگ ایسے کھاتے ہیں جیسے غریب غصہ کھاتے ہیں اور کچھ لوگ تو کھانا کھاتے ہوئے اپنے کپڑوں پر شوربے اور چٹنی کی کڑھائی کا اعلیٰ نمونہ بھی پیش کر رہے ہوتے ہیں۔

آج کل ولیمے پر بوتلیں کھلے عام اور مرغ چوری چھپے اُڑائے جاتے ہیں۔

اب ولیمہ ہو رہا ہو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ ولیمہ ہو رہا ہے یا کسی فلم کا ہاف ٹائم ہو رہا ہے۔

شادی کے دِن دولہا کو اتنا سجایا جاتا ہے کہ وہ اپنی بربادی کو بھول کر اپنی سجاوٹ پر دِل ہی دِل میں خوش ہوتا رہتا ہے۔ کبھی وہ منہ پر رومال رکھتا ہے تو کبھی پسینہ صاف کرتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دولہا نے کئی شادیاں کر رکھی ہوتی ہیں وہ اپنی سابقہ بیویوں سے منہ چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ دولہا منہ پر رومال اس لیے رکھتا ہے کہ اسے دُلہن کے گھر سے خاص قسم کی بو آ رہی ہوتی ہے۔ دولہا کے سر پر سہرا اور ہاتھ میں چھڑی دی جاتی ہے تا کہ وہ بوقتِ ضرورت اپنی سالیوں کے خلاف اپنا دفاع کر سکے۔

دولہا میاں سہاگ رات عجیب کشمکش میں گزارتے ہیں گھر والے باہر اور باہر والے دولہا کو اندر بھیجتے ہیں اور دولہا میاں پنڈولم کی طرح ساری رات اندر اور باہر کے چکروں میں گزار دیتے ہیں۔ دولہا میاں اندر جاتے ہیں تو گھاگھ قسم کی عورتیں صبر کی تلقین کر کے باہر بھیج دیتی ہیں اور باہر جاتے ہیں تو دور اندیش بزرگ اندر جانے کی وصیت کرتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں دھوبی کا کتا ''گھر کا نہ گھاٹ کا۔''

جب شادی گزر جاتی ہے تو پھر گھر کے تمام افراد پٹواریوں کی طرح رجسٹر پکڑ

کرفرشتوں کی طرح حساب کتاب شروع کر دیتے ہیں کہ کس نے کیا دیا اور کیا لیا؟

کچھ لوگ شادی کے فوراً بعد ہنی مون منانے کے لیے دور دراز علاقوں میں چلے جاتے ہیں۔ ایسے لوگ جو ہنی مون کے شوقین ہوتے ہیں ان کو ''ہنی مونیا'' کا مریض کہا جاتا ہے۔ ''ہنی مونیا'' بھی ''نمونیا'' کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے فرق ان دونوں میں صرف یہ ہے کہ نمونیا میں آدمی کو ''پالا'' لگتا ہے اور ہنی مونیا میں ''پالا پڑ'' جاتا ہے۔

عموماً شادی سے پہلے اور خصوصاً شادی کے بعد لوگ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ خوش فہمی جلد ہی شادی کے چند روز بعد دور ہو جاتی ہے جب دلہن شاپنگ کا مطالبہ کرتی ہے اور یوں دولہا میاں Default ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ سمجھ دار لوگ خود شاپنگ کرتے ہیں چاہے اس کام کے لیے ان کو خود نقاب پہن کر ہی کیوں نہ جانا پڑے۔

دولہا میاں جب سسرال جاتے ہیں تو سسرال والے ایسے ڈراتے ہیں جیسے ڈالر ہمارے بھولے بھالے روپے کو ڈراتا ہے۔ خاص طور پر دولہا میاں اپنے ''سسر'' کے سامنے تو ''سسری'' کی طرح سو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اس کو تھوڑی دیر کے لیے شدید غصہ آتا ہے لیکن پھر بیوی کو دیکھتے ہی غصہ جلدی سے ایسے اُتر جاتا ہے جیسے اذان کے بعد خواتین کے سر سے دوپٹہ۔

شادی ہر کسی نے کرنی ہے کوئی پہلے کر لیتا ہے تو کوئی بعد میں۔ شادی زندگی کی بقا کے لیے ضروری اور زندہ رہنے کے لیے مضر ہے۔ کچھ باتیں ایسی ہیں جو صرف

اور صرف تجربے سے حاصل ہوتی ہیں۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو آپ پر ترس آتا ہے اور اگر آپ غیر شادی شدہ ہیں تو آپ پر رشک آتا ہے۔

ایک بزرگ فرما رہے تھے کہ شادی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ حالانکہ اگر جذباتی ہو کر سوچا جائے تو شادی ہے ہی بچوں کا کھیل۔

حسین رفاقتوں کی غلطیاں جب سامنے آتی ہیں تو انسان کو خواہ مخواہ شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے ہر لڑکی خوبصورت نظر آتی ہے اور شادی کے بعد معلوم نہیں کیوں مردوں کی آنکھوں میں موتیا اُتر آتا ہے کہ کسی بھی لڑکی کو دیکھنے سے پہلے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر ایسے مواقع نہ آئیں تو شاید شوہر حضرات کبھی بیوی کی طرف دیکھنے کی زحمت گوارہ نہ کریں۔

عورت وہ مخلوق ہے جو ہماری پسلی سے پیدا ہو کر ہماری ہڈی پسلی ایک کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حضرت آدم نے شجرِ ممنوعہ کو چھو کر جو غلطی کی وہ تو ہے ہی مگر اپنی پسلی سے اس آتشیں مخلوق کو جنم دے کر ہم سب کو مخمصے میں ڈال دیا ہے کہ اگر اس شجرِ ممنوعہ کو چھوا تو نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات یعنی درجن بھر بچے ہوگا اور اگر نہ چھوا تو لوگ ہماری جوانی اور مردانگی پر شک کریں گے اسے کہتے ہیں:

"Hanging bet ween the two fires"

○○○

بیمارستان

ہمارے تھانوں اور ہسپتالوں میں محض یہ فرق ہے کہ ہسپتالوں میں پرچی ہوتی ہے اور تھانوں میں پرچہ۔ بالخصوص ہسپتالوں میں مریضوں کے ساتھ وہی سلوک ہوتا ہے جو ترقی یافتہ ممالک تیسری دُنیا سے روا رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر حضرات اسٹیتھو سکوپ سے مریض کا دل چیک کرنے کے بجائے اس کی جیب چیک کرتے ہیں۔ پھر خدانخواستہ اگر کوئی مریض آپریشن تھیٹر تک جا پہنچتا ہے تو یہی ڈاکٹر حضرات اس سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں تاکہ کہیں یہ ہمیں پہچان نہ لے یعنی چوروں کی طرح منہ پر ماسک چڑھا لیتے ہیں اور چونکہ مریض وہاں ہوتا ہے ''جہاں سے اس کو کچھ اپنی خبر نہیں آتی۔'' یوں بعض اوقات آپریشن تھیٹر سے مریض بعد میں آتا ہے اور اس کی خبر پہلے۔ اس لیے ڈاکٹر حضرات آپریشن تھیٹر کو ''تھیٹر'' سمجھتے ہوئے مریض کے ساتھ عجیب وغریب قسم کا ڈراما کرتے ہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں

آتا حتیٰ کہ خود ڈاکٹر حضرات کی بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

چیونٹیوں کی طرح ڈاکٹروں کی بھی کئی اقسام ہوتی ہیں نیز شکل کے حوالے سے بھی یہ ایک دوسرے سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کے سر سے بال اس طرح غائب ہوتے ہیں جیسے چودھویں کی رات کو اندھیرا۔ عموماً ڈاکٹروں کا یہ خیال ہے کہ نام روشن کرنے کے لیے پہلے اپنا آدھا سر روشن کرنا پڑتا ہے۔

ہسپتال کے ایم۔ ایس کی شکل وشباہت خاص طور پر اکثر ایسی ہوتی ہے کہ لمبی داڑھی، آنکھیں بڑی بڑی اور آدھے سر تک بالوں کا فقدان! تاہم سر کی آخری سرحدوں پر آثارِ زلف ہویدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ دور سے دیکھنے والے شخص کو ''فرنٹ ویو'' کا دھوکہ ہوتا ہے منتظر مریضوں کے ساتھ تو اکثر یہ گمان گزرتا ہے کہ ایم۔ ایس صاحب آرہے ہیں جب کہ وہ جارہے ہوتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی ایک اور عادت بھولنا بھی ہوتی ہے۔ جیسے گھر سے گھبرائے ہوئے نکلتے وقت وہ بعض اوقات ''فرسٹ ایڈ بکس'' کے بجائے بیگم کا بیوٹی بکس ہی اُٹھالاتے ہیں۔ یا پھر آپریشن کے وقت سوئیاں پیٹ کے اندر چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض بدگمان حضرات کا کہنا ہے ڈاکٹر حضرات ایسا بھولے سے نہیں کرتے بلکہ خوب سوچ سمجھ کر کرتے ہیں تاکہ سوئیاں نکالنے کے الگ پیسے وصول کیے جاسکیں حالانکہ یہ سراسر بہتان ہے اب تو ڈاکٹر بائیں گردے کا آپریشن اپنے ہاتھ کی سمت کے مطابق دایاں گردہ سمجھ کے کر دیتے ہیں کیونکہ مریض ان کے سامنے بالکل سیدھا بے حس لیٹا ہوتا ہے۔ اب یہ کام تو مریض کا ہے کہ ڈاکٹروں کے سامنے ایسے لیٹے کہ ان کو غلطی کا

سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہمارا یقینِ کامل ہے کہ پروفیسروں کی طرح ان کی بھی یادداشت ہی وفا نہیں کرتی ہوگی۔ اس میں ان بے چاروں کا کیا قصور!

آپریشن تھیٹر میں ڈاکٹروں کا لباس دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کفن باندھے مرنے کو تیار ہوں۔ بے چارے مریض کو یہ بغیر کفن کی تیاری کے ہی بغیر اسے بتائے مارنے سے گریز نہیں کرتے اور جیتا ہوا مریض ڈاکٹروں کی بدقسمتی سے اگر بچ جائے تو اردگرد سفید کوٹ میں ملبوس ڈاکٹر اسے منکر نکیر لگنے لگتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ علاج کا حساب مانگتے ہیں اور وہ محض اعمال کا حساب مانگیں گے۔ یوں بعض حسابی کتابی قسم کے سرجن تو فارغ اوقات میں جوتوں کو بھی ٹانکے لگا دیتے ہیں۔

مریضوں کو اتنی گولیاں لکھ دی جاتی ہیں کہ اس سے ایک ہی گولی مار دینا زیادہ احسن اقدام ہوگا۔ ڈاکٹروں کی دانش ''مندی'' کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے جو عموماً مریضوں کو یہ بتاتے ہیں کہ یہ دوا سونے سے پہلے لیں، یہ سوتے وقت اور یہ سونے کے فوراً بعد۔

مریض کے سرہانے دھری ہوئی شیشیاں اور کیپسول اپنی جگہ اس کا معدہ بھی اچھا خاصا میڈیکل سٹور بن جاتا ہے۔ دواؤں کی قیمتیں دیکھ کر بازار سے دوائیں لانے والا ''چنگا بھلا'' بندہ بھی مریض بن کر لوٹتا ہے اور بیمارستان کی رونق دوچند کرنے کا سبب بنتا ہے اور اس پر ستم یہ کہ اسے پھل کھانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح صبر کے پھل پر ہی گزارہ کرتا ہے۔

ذہن اور جیب کے کمپلیکس کا شکار مریض جب ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے تو

وہ اسے وٹامن اے کمپلیکس اور وٹامن بی کمپلیکس میں بدل دیتا ہے۔

ایک قسم نہ ہی ڈاکٹر حضرات کی بھی ہوتی ہے وہ ہر بے پردہ عورت کے لیے ایک ہی نسخہ تجویز کرتے ہیں یعنی ''حیاء تین'' کی کمی۔

ڈاکٹروں کی لکھائی کا بھی کیا کہنا یوں لگتا ہے جیسے الٹے ہاتھ سے اُلٹا لکھا گیا ہو (اگرچہ بعض ڈاکٹر نسخے واقعی اُلٹے ہی لکھتے ہیں) ایک صاحب کے بچے نے جب لکھنا شروع کیا تو وہ بچے کی اس کامیابی کو دکھانے کے لیے اپنے ایک کیمسٹ دوست کے پاس لے گیا تو کیمسٹ صاحب نے وہ کاغذ دیکھ کر ڈھیر ساری دوائیں تھماتے ہوئے کہا ان میں ایک رہ گئی ہے وہ کہیں اور سے لے لو۔

ہمارے ہسپتالوں کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں مکھیاں اور مچھر بالکل نہیں پائے جاتے کیونکہ وہ اتنی زیادہ گندگی میں زندہ ہی نہیں رہ سکتے۔ ہسپتال میں ہر آٹھواں فرد مریض ہوتا ہے اور باقی سات تیماردار۔ مریض کے ٹھیک ہونے تک ایک نہ ایک تیماردار اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے۔ یوں یہ سلسلہ بیڈ در بیڈ اور نسل در نسل چلتا ہی رہتا ہے اور اس مقام پر آ کر پتا چلتا ہے کہ ہسپتالوں میں نسلی امتیاز نہیں برتا جاتا۔ اس طرح یہ فرائض ہماری حکومت کی طرح بدلتے رہتے ہیں گویا کبھی تیماردار مریض ہوتا ہے تو کبھی مریض تیماردار۔

اپنے سر سے بوجھ اُتارنے کے لیے بہت سے ڈاکٹر مریض کے اہل وعیال کو ''دوا'' کے بجائے ''دعا'' کا مشورہ دیتے ہیں۔ بات بھی ٹھیک ہے اگر مریض کو صرف دوا ہی سے شفا ملتی تو آج اس ملک میں خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت نہ پڑتی۔

ہمارے ہاں ہر دوا امپورٹڈ ہوتی ہے اس سخاوت کے پسِ پُشت غریب ممالک پر تجربے کی دوا بھی کارفرما ہوتی ہے۔

بیمارستان کا ایک اور اہم حصہ نرسیں ہیں جنہیں عموماً ''سسٹرز'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ اتنی مستعد ہوتی ہیں کہ عموماً رات کو سوتے ہوئے مریض کو اُٹھا کر ڈاکٹر حظ رات معاف کیجئے گا ڈاکٹر حضرات کی ہدایت کے مطابق اسے نیند کا انجکشن لگانا نہیں بھولتیں۔

ان میں سے کچھ کی چال ڈھال حرکات وسکنات اور انداز وادائیں بخار کے مریض کو بھی دِل کا مریض بنا دیتی ہیں اور بعض تو دِل پھینک قسم کے مریض ساری بیماریوں کو چہرے پر لا کر یہ بھی پکار اُٹھتے ہیں کہ ''سسٹر آئی لو یو'' اور کچھ نرسیں کرخت مزاج ہوتی ہیں جن کی آواز سے مریضوں کی بے ہوشی کا کام لیا جاتا ہے۔

یہ نسخہ ہے کم خرچ بالانشیں۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ طب کے شعبے نے بھی کافی ترقی کی ہے اور اب جسم کے ہر عضو کے علاج کے الگ الگ ڈاکٹر ہیں جیسے ''آنکھوں والا ڈاکٹر'' ''کانوں والا ڈاکٹر'' اور ''دانتوں والا ڈاکٹر'' یہ سائن بورڈ پڑھ کر اکثر ہمیں صوتی آہنگ میں مماثلت کے باعث ''عینک والا جن'' یاد آتا ہے۔

بورڈ پر درج ہوتا ہے۔ یہاں آنکھیں بنائی جاتی ہیں اور دینٹسٹ نے لکھا ہوتا ہے کہ ''یہاں دانت نکالے جاتے ہیں'' گویا خوب ہے مریض کی تو جان پر بنی ہے اور ڈاکٹر صاحب دانت نکال رہے ہیں اور یوں یہ آنکھیں بناتے اور دانت

نکالتے نکالتے چھوٹے سے پرائیویٹ کلینک سے بڑی بڑی کوٹھیوں میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر یہ راوی کنارے رہنے والے ''گلشن راوی'' اور رنگ محل میں رہنے والے رنگ بازی کرتے کرتے ''محل'' میں جا بسیرا کرتے ہیں۔ بعض سمجھ دار اور دور اندیش ڈاکٹر اپنی تقریبات میں فوٹو کے بجائے ایکسرے اور فلم کے بجائے الٹراساؤنڈ مشین کا استعمال کرتے ہیں۔ اکثر لوگ کسمپرسی کی حالت میں ہسپتالوں کے باہر ایسے بیٹھے ہوتے ہیں جیسے کسی دربار پر لنگر کے انتظار میں ہوں اور ان کو اس لیے اندر نہیں جانے دیا جاتا کہ اندر ڈاکٹر صاحب راؤنڈ یعنی ''چکر'' پر ہوتے ہیں۔ اس طرح غریب مریضوں اور ان کے تیمارداروں کی حالت زار دیکھ کر ہسپتال زندہ قبرستان لگنے لگتے ہیں۔

بسترِ مرگ پر موجود بعض بابے اور مائیاں جو عمر کی سینچری کو ڈبل سینچری میں تبدیل کرنے کے آرزومند ہوتے ہیں جبکہ ان کی اننگز کورن آؤٹ کا دھڑکا لاحق ہوتا ہے۔ ان کے عزیز واقارب ان کے لیے دعا گو ہوتے ہیں کہ یا اللہ انہیں اب ''پردہ'' دے دے بے شک موصوفہ نے عمر بھر پردہ نہ کیا ہو اور ستم تو یہ ہے کہ وہ پردے کی ذمہ داری بھی اللہ پر ہی ڈال دی گئی ہے۔

ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنے والے نیم ڈاکٹر بھی پائے جاتے ہیں۔ جب ہسپتال میں کوئی لاوارث قسم کا مریض آجائے تو اس پر یہ آپریشن کرنا سیکھتے ہیں اور یاد رہے کہ یہ صرف مینڈکوں کا درست آپریشن کرتے ہیں کیونکہ صرف مینڈکوں کے درست آپریشن پر ان کے مستقبل کا دارومدار ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ ہسپتالوں میں گائنا کالوجسٹ بھی پائی جاتی ہیں جو دیکھنے میں ''ڈائنا کالوجسٹ'' ہی نظر آتی ہیں۔ وہ ہر ''زچہ'' کو آنے والے ''بچہ'' کی صحت کے بارے میں ہدایات جاری کرتی رہتی ہیں اور یہ بھی کہتی ہیں کہ ''بچے ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں۔'' تاہم بعد میں وہ ہمارے سیاستدانوں کی طرح اپنے بیان سے ہی پھر جاتی ہیں اور پھر وہ انہی کو ایسی دوائیں دیتی ہیں جو مذکورہ قیمتی سرمائے کو روکنے کا سبب بنتی ہیں۔

مریضوں کے بہت سے لیبارٹری ٹیسٹ کروانا بھی ڈاکٹروں کا مشغلہ خاص ہے اور اس پر ستم یہ کہ ان کے نتائج بھی پنجاب یونیورسٹی کے نتائج سے مختلف نہیں ہوتے۔ یوں اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض اگلی دنیا میں اپنے کیے کے نتائج بھگت رہا ہوتا ہے اور اس کے لواحقین یہاں اس کی بیماری کے نتائج وصول کر رہے ہوتے ہیں۔ لواحقین نتائج دیکھ کر اس پر سر کھپاتے ہیں کہ ''ہوا کیا تھا'' جبکہ اگلی دنیا میں وہ بے چارا یہ جواب دے رہا ہوتا ہے کہ اُس نے ''کیا کیا تھا۔''

ڈاکٹروں سے سارے گلے شکوے بجا سہی مگر ان کی ایک کامیابی ہی ان کی ساری خامیوں پر حاوی ہے کہ انہوں نے انسان کے جسم سے پتھر نکال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ موجودہ انسان پتھر کا ہے اور الٹراساؤنڈ مشین کے استعمال سے اس گھمبیر صورتِ حال کو بھی منظرِ عام پر لے آئے ہیں کہ آج کا انسان اندر اور باہر سے ایک نہیں۔

ooo

''رنج لیڈر کو بہت ہیں''

ہمارے ہاں الیکشن متعدی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جو ایک دفعہ اس میں کھڑا ہو جاتا ہے لوگ اس کے پاس بیٹھنے سے کنی کترانے لگتے ہیں۔ ویسے بھی الیکشن میں کھڑا ہونے والا ہار کے بعد اپنے پاؤں پر بھی کھڑا نہیں رہتا اور اگر کبھی خوبیٔ قسمت اور دوسرے اُمیدوار کی خرابیٔ قسمت کی وجہ سے جیت بھی جائے تو پوری قوم کی جڑوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ پاکستان میں اب الیکشن باقاعدہ وزارت کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ کساد بازاری کے اس دور میں بھی اُمیدواروں کی سیکورٹی فیسوں کی وجہ سے حکومتی آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

خواتین سیٹوں پر زنِ بازاری کی اکثریت کے کامیاب ہونے کی وجہ سے ''دوسرے شعبوں'' کی ترقی کے بھی وسیع امکانات موجود ہیں۔

الیکشن کا اعلان ہوتے ہی جو اُمیدوار جامے میں پھولے نہیں سماتے چند دِن

کی ووٹ مانگ مہم جو دراصل بھیک مانگ مہم سے مشابہ ہوتی ہے سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ کہاں وہ تانا شاہی وشانِ کئی کہ لوگوں کے سلام کا جواب دینے کی بھی فرصت نہیں اور کہاں بہادر شاہ ظفری و در بدری کے ہر ایرے غیرے اور نتھو خیرے سے تپاک سے ملتے اور ہاتھ ملاتے ہیں اور بعد میں ہار کر ہاتھ مَلتے ہیں۔

ایک حلقے کے ایم۔ این۔ اے جو کسی دور میں اس ملکِ خداداد کے وزیرِ مملکت بن بیٹھے تھے (نام اس لیے نہیں لکھ رہا کہ فسادِ خلق کا خطرہ اور اس بات کا اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں ان کے ووٹ بینک میں اضافہ نہ ہو جائے جواب غریب کے بینک بیلنس کے برابر ہے)

وزیرِ موصوف وزیری کے دور میں اسلام آباد کو اپنی آخری آرام گاہ سمجھ بیٹھے تھے لیکن جب اسمبلیاں ٹوٹنے کا چھنا کا ہوا تو ہانپتے کانپتے آبائی حلقے میں پہنچے اور آتے ہی عوامی رابطہ مہم اس زور و شور سے شروع کی کہ آندھی طوفان کو ماند کرنے والی رفتار سے علاقے کے دورے شروع کر دیئے۔

جس جگہ جاتے خود بڑے تپاک سے دوسروں سے ہاتھ ملاتے گلے لگاتے اور جن لوگوں کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہوتا کہ آئندہ الیکشن میں مجھے ووٹ نہیں دیں گے ان کے ہاتھ بھی چومتے شام کا وقت تھا۔ رابطہ مہم ختم کر کے واپس گھر جا رہے تھے۔ ڈرائیور تمام دن کی خجل خواری سے بیزار تیزی سے گاڑی چلا رہا تھا کہ آپ نے اچانک بریک لگانے کا حکمِ نادر شاہی جاری کر دیا۔ بریک چرچرائے اور آپ فوراً گاڑی سے اُتر کر سڑک کے کنارے کی طرف بڑھے تاکہ اندھیرے میں کھڑے شخص

سے مصافحہ و معانقہ کر کے اسے اُجالوں کی نوید سنا سکیں۔ یاد رہے الیکشن کے دنوں میں ان کو اندھیرا ابھی صاف ہی دکھائی دیتا ہے۔ ڈرائیور حیران و ششدر کہ صاحب کس چیز کو گلے لگا کر تقریر فرما رہے ہیں۔ چند ساعتوں بعد ڈرائیور گاڑی سے اترا اور اس نے بڑی مشکل سے وزیرِ موصوف کے جبڑے سے کیکر کے تنے کو چھڑوایا۔ اگرچہ وہ تنا بھی بعد میں سوکھ گیا۔

ہر اُمیدوار اچھے بُرے دنوں کے لیے حلقہ میں اپنے خاص کارندے رکھ چھوڑتا ہے جو الیکشن مہم میں اس کے شانہ بشانہ کام کرتے ہیں اور اکثر اوقات اپنے امیدوار سے بھی مہم جوئی میں دو قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک بزرگ کا قصہ سینے جو ایک اُمیدوار کی الیکشن مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔

آپ کو پینے پلانے سے ایسا شغف تھا کہ اس معاملے میں غالب پر بھی غالب تھے۔ موسم خوشگوار تھا خوب پیئے ہوئے تھے اور اسی حالت میں الیکشن مہم پر نکل کھڑے ہوئے۔ تمام دِن اپنی طرف سے خوب محنت سے ووٹ مانگے۔ شام کے وقت الیکشن آفس میں سینہ تان کر پہنچے اور آتے ہی اعلان فرمانے لگے کہ فلاں فلاں علاقے کے تمام لوگوں نے ہمارے حق میں رائے دہی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب ہماری کامیابی یقینی ہے۔

الیکشن آفس میں بیٹھے ہوئے لوگ پہلے تو خوش ہوئے پھر حیران ہوتے ہوئے پریشان ہو کر کہنے لگے یا حضرت وہ علاقے تو ہمارے حلقہ میں ہی شامل نہیں ہیں۔ آپ نے اس علاقے کے لوگوں کو خاصی موٹی گالی سے نوازتے ہوئے

فرمایا۔۔۔پھر انہوں نے ہاں کیوں کی تھی؟

ایک حلقہ کے ایم۔پی۔اے جو تین دفعہ مسلسل ہارنے کے بعد جیت بیٹھے تھے۔ایک دفعہ سڑک کا افتتاح کرنے پہنچے۔آپ کے زورِ بیان کا شہرہ ہم نے بھی سنا تھا چنانچہ مستفید ہونے کا فیصلہ کر کے جلسہ گاہ میں پہنچ گئے۔لوگ جوق در جوق وہاں پہنچ رہے تھے اور وہ جوک در جوک انہیں محظوظ کر رہے تھے۔

جب وہ دورانِ تقریر اپنے کارناموں کے احوال بتانے لگے جو جیتنے کے بعد اُن سے سرزد ہوئے تھے تو زورِ بیان میں لوگوں سے کہا ''میں نے اپنے حلقے کو پانی پانی کر دیا ہے۔''

لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں۔ہمیں بھی ماننے ہی بنی کیونکہ ہم دیکھ رہے تھے کہ ان کے اس جملے کے بعد اُن کے خیر خواہوں کے منہ پر بھی چند قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

تقریر کے بعد اس سڑک کا افتتاح کیا جو ٹوٹ پھوٹ کے مراحل میں داخل ہو چکی تھی۔اب لوگوں نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے مطالبات کا راگ الاپنا شروع کر دیا۔آپ نہایت مدھر اور سریلی آواز میں ''جواب'' دیئے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک پڑھے لکھے صاحب اُٹھے اور انہوں نے عرض کیا ''جناب ہمارے علاقے میں زچہ بچہ سنٹر نہیں ہے اس لیے ہر دفعہ نارمل کیس خراب کروانے کے لیے ہمیں شہر جانا پڑتا ہے۔''

آپ نے جوشِ خطابت اور جذبۂ خدمتِ خلق سے معمور آواز میں فرمایا!

آپ ایک زچہ بچہ سنٹر کی بات کرتے ہیں۔میں دو بنواؤں گا عورتوں کے لیے الگ اور مردوں کے لیے الگ۔اُن کی اس فراخدلی، ہمدردی اور دُور اندیشی پر لوگ عش عش کر اُٹھے۔بعض ناسمجھ خواہ مخواہ غش کھانے لگے۔لیڈر ہوں تو ایسے!

ع جو چاہے ''آپ کا'' حُسنِ کرشمہ ساز کرے

ooo

''براتِ عاشقاں۔۔۔''

ایک دُور اندیش صاحب کے بقول ''دُنیا میں جتنی عورتیں ہیں ان کی اتنی ہی قسمیں ہیں اور میں جب بھی منزل پر پہنچتا ہوں تو لکھا ہوتا ہے کہ سو کلومیٹر آگے۔''

یہی صورتِ حال بالکل عاشق حضرات کی ہے ان کو بھی منزل ہمیشہ آگے سے آگے نظر آتی ہے اور کیوں نہ ہو! خوب سے خوب تر کی تلاش سب کا حق ہے اور انہی کے بارے میں تو حالی نے کہا تھا کہ:

ع ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں

بمطابق عشاق حضرات شریعتِ عشق کی کئی اقسام میں منقسم کیے جاسکتے ہیں۔

پہلی قسم تو موبائیل عاشقوں کی ہے جو گلیوں، محلوں اور بسوں میں نظر آتے ہیں۔ ان کی چیدہ چیدہ خصوصیات میں سیٹی بجانا، لمبے بال رکھنا (اور ان میں جوؤں کی الاٹمنٹ کرنا) اور ہاتھ میں پھول پکڑے ہونا شامل ہے۔ آپ کو یہ ہر گلی محلے میں

دستیاب ہوں گے کیونکہ ہمارے معاشرے میں یہ قسم کثرت سے بوئی اور کاٹی جاتی ہے۔ ان کا مقصودِ نظر بھی مخصوص نہیں ہوتا۔ مثل مشہور ہے کہ ''دانے دانے پہ لکھا ہے کھانے والے کا نام'' مگر ان کے سامنے یہ ضرب المثل بھی ضرب کھا چکی ہے کیونکہ مُہر ان کی جیب میں ہوتی ہے اور جہاں ''دانہ'' دیکھتے ہیں وہاں جھٹ سے مہر لگا دیتے ہیں۔ عشاق کی حوصلہ افزائی میں غالب کا بڑا ہاتھ ہے مرحوم نے یہ کہہ کر:

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ان عاشقوں کے حوصلے دو چند کر دیے ہیں کہ میدان میں ڈٹے رہو! حد ہوگئی یعنی ایک بار کامیاب ہوگئے تو پھر ساری عمر آگ میں جلتے رہیے۔ چلیں فائدہ تو ہے عاشق پر پتیلہ دھریں کھانا تیار، توّا دھریں روٹی تیار۔ سوئی گیس کا بل بھی تو نہیں آئے گا نا! اور سردیاں بھی مزے میں گزر جائیں گی۔ ہمارا ذاتی خیال ہے یہ مشورہ غالب نے سرد ممالک کے باشندوں یعنی یورپ والوں کو دیا تھا لیکن اس سے مستفید سبھی ہو رہے ہیں۔ غالباً انہیں غالب کا یہ مصرع پسند آ گیا ہوگا۔

ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

عاشقوں کی ایک قسم فلمی ہیروئینز پر دِل لٹانے کو تیار رہتی ہے۔ اِدھر کسی عشوہ و ادا سے معمور فلمی ہیروئین کا جلوہ دیکھا، دِل لٹا بیٹھے پھر جونہی محبوب کی فلم سینما میں پہنچتی ہے اور یہ پہلے ہی ٹکٹ کٹائے بیٹھے ہوتے ہیں چاہے اس کام کے لیے ان کو اپنے ابا جی کا بٹوا ہی کیوں نہ ہتھیانا پڑے۔ ان عاشقوں کے متعلق اور کیا کہیں۔

ع انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند

اور چاند کب ملتا ہے! آفت کی پڑیا فلمی ہیروئین تک پہنچنے کے چکر میں یہ ہیروئین کی پڑیا کے عادی ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے نشے میں ایسا اُلجھتے ہیں کہ عشق وشق بھول جاتا ہے۔

ایک قسم روایتی عاشقوں کی ہے جن کی حالتِ زار پُنوں اور رانجھا کے آخری ایام کی یاد تازہ کر دیتی ہے۔ یہ عاشق معاشرے کو فائدہ پہنچائیں نہ پہنچائیں لیکن میڈیکل کے نو واردوں کے لیے یہ کافی مفید ثابت ہوتے ہیں اور میڈیکل کے اساتذہ مختلف اعضا کی تشریح و توضیح کے لیے ان کی تصاویر کا سہارا لیتے ہیں گویا میڈیکل کی نصابی ضروریات کے لیے ان کا وجود نعمتِ مبتر کہ کا درجہ رکھتا ہے۔

جہاں تک پڑھے لکھے عشاق کا تعلق ہے تو یہ بھی اتنے امیر نہیں ہوتے۔ ان کا کوئی مخصوص حلیہ نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنے روزگار یا اخراجات کے مطابق گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بے چارے تھری پیس تو نہیں پہن سکتے البتہ عشق ان کے ون پیس کے کئی پیس کر دیتا ہے۔ اس طرح ان کی زندگی میں سے ''پیس'' بھی جاتا رہتا ہے۔ ''پی۔سی'' (P.C) جانا تو ان کے بس میں نہیں ہوتا البتہ ''پی۔سی۔او'' (P.C.O) سے ضرور استفادہ کرتے ہیں۔ ان کی ریاضی کی کتابوں پر بھی عشقیہ اشعار اور فائلوں پر فلمی ستاروں کی تصویریں نظر آتی ہیں اگرچہ ان کا اپنا ستارہ گردش میں ہی رہتا ہے۔ دیکھنے میں صاف ستھرے لیکن اندر سے بہت میلے ہوتے ہیں! سرف Excel بھی ان کے دِل سے عشق کے داغ دھبے نہیں

مٹا پاتا۔ شاید اسی لیے میرؔ نے کہا تھا:

یہ نشانِ عشق ہیں جاتے نہیں
داغ چھاتی کے عبث دھوتا ہے کیا؟

ان کے علاوہ کچھ عشاق کی راہ میں ان کی نیم خواندگی حائل ہو جاتی ہے۔ وہ کالج کے احاطے کے اندر نہیں جا سکتے چنانچہ چھٹی کے وقت کالج کے باہر کھڑے ہو کر تسکینِ قلب و جاں کا سامان فراہم کرنے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں۔ ان کے بارے میں اکبرالہ آبادی نے کہا تھا:

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے۔ بی میں رہے اغیار بی۔ اے ہو گئے

ہم نیا ڈائیلاگ یاد کرنا اور پھر اس کا ''مناسب جگہ'' پر استعمال کرنا ان کا فرضِ منصبی ہوتا ہے۔

کچھ عاشق تو بہت ہی بُرے نصیب والے ہوتے ہیں اور وہ یہ گنگناتے نظر آتے ہیں:

بُرے نصیب میرے ویری ہو یا پیار میرا!

زمانہ ان کا خاص دشمن ہوتا ہے جو انہیں محبوب کے قریب پھٹکنے نہیں دیتا اور کبھی خوش قسمتی سے نظریں بچا کر وہ اس میں کامیاب ہو جائیں تو پھر موقع محل ان سے ستم ظریفی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا اور یوں وہ پیچھے اور محبوب آگے! یہ محبوب سے ملاقات کا موقع محل ڈھونڈتے رہتے ہیں کیونکہ ''محل'' لینا ان کی پہنچ سے

دور ہے اس لیے یہ صابر لوگ موقع محل پر ہی قناعت کرتے ہیں! آخر۔

ع قناعت بڑی چیز ہے اس جہاں میں

ان کا خمیر جلد بازی کی مٹی سے گندھا ہے۔ اگر محبوب سے کبھی ملاقات ہو جائے تو فوراً رسمی گفتگو ترک کر کے یہ پہلی فرصت میں اس سے شادی کی بات چھیڑ دیتے ہیں! نتیجتاً محبوب اتنا بھی کہنا گوارا نہیں کرتا۔

ع ہمیں مت چھیڑیے ہم سر پھرے ہیں

اور پہلی فرصت میں انکار داغ دیتا ہے! اور ان کی متاعِ عزیز اور دِل ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔

ع وائے ناکامی متاعِ عاشقاں جاتی رہی

کچھ عاشق حضرتِ میرؔ کے پیروکار ہوتے ہیں اور یہ کہہ کر دِل کو تسلی دیتے ہیں کہ:

دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اُس سے
عشق بِن یہ ادب نہیں آتا

اس شعر کے بارے میں ایک محقق نے فرمایا تھا کہ اس شعر سے یہ پتا چلتا ہے کہ میرؔ کے دور میں بھی نہ صرف غبارے ہوتے تھے بلکہ ادب بھی بغیر عشق کے نہیں آتا تھا۔

اس طرح یہ محبوب کو دِل ہی دِل میں چاہتے اور کوستے رہتے ہیں یہ آزاد انتخابی اُمیدوار کی طرح کھل کر سامنے نہیں آتے۔ یہ محبوب کو اپنانے کا کم سوچتے ہیں

بلکہ اس کے اجزائے حُسن کے لیے تشبیہاتِ جمالی کی فکر میں زیادہ سر کھپاتے ہیں حالانکہ اتنا وقت محبوب کو پانے کے طریقوں پر غور کرنے میں صرف کریں تو شاید کوئی راہ نکل ہی آئے۔

بعض عاشق مبالغہ آرائی میں شعرا کو بھی بہت پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اکثر اپنی محبوبہ سے جب گرمیوں کے موسم میں ملتے ہیں اور درجہ حرارت ۵۵ درجہ سینٹی گریڈ پر ہوتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ ''دیکھو جانم! باہر موسم کتنا حسین ہے یہ سب تمہاری ہی وجہ سے ہے۔''

کچھ عاشق عاشقی کو قیدِ شریعت میں لے آتے ہیں اور پھر عاشقی بعد میں اور ہی جلوے دکھا جاتی ہے یعنی:

عاشقی قیدِ شریعت میں جب آ جاتی ہے
جلوۂ کثرتِ اولاد دکھا جاتی ہے

ان معشوقوں کا بھی کیا کہنا کہ درجن بھر بچے پیدا کر کے بھی اپنے خاوند سے شکوہ کناں رہتی ہیں کہ ہمیں ابھی تک سچا پیار نہیں ملا۔

بہر حال عشق ایک ایسا مرض ہے جو شادی کے بعد بھی لاحق رہتا ہے۔ اس طرح شادی شدہ عاشقوں کی بات ہی نرالی ہے۔ یہ بیوی کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں جو پاکستانی حکومت آئین کے ساتھ کرتی رہتی ہے۔

یہ اپنی محبوبہ کے سامنے اپنی بیوی کو دُنیا کی ظالم ترین عورت ثابت کرتے ہیں جبکہ بیوی کے سامنے اگر محبوبہ کا ٹکراؤ ہو جائے تو یہ اسکو پہچاننے سے بالکل ایسے ہی

انکار کر دیتے ہیں جیسے ہمارے سیاستدان الیکشن کے بعد ووٹروں کو۔ کچھ عاشق شوباز قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ ہر نئے دِن محبوبہ میں تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں (لیکن اپنے دِل میں) اور دوستوں میں بیٹھ کر اپنی جھوٹی عشقیہ داستانوں کے تذکرے کرتے رہتے ہیں جو ان کے خیال میں عشق کا حاصل ہیں۔

کچھ بزدل قسم کے عاشق ہوتے ہیں جو محبوب کو جھوٹے خواب دکھاتے رہتے ہیں اور بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں مثلاً میں تمہارے لیے گردن کٹوا سکتا ہوں اور اگر تم کہو تو تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں مگر بعد میں پھر آہستہ سے یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ! دیکھنا کسی دِن بھولے سے ایسا کہہ ہی نہ دینا۔ یہ وہ عاشق ہیں جو اپنے محبوب کے ہاتھ سے زہر بھی پینے کو تیار ہوتے ہیں لیکن ان کی ایک شرط ہوتی ہے کہ وہ زہر ناخالص ہو۔

ایک دفعہ ایک عاشق کو لینے کے دینے پڑ گئے مگر وہ بھی بہت کھرانٹ تھا اس نے بڑی دانشمندی سے کام لیا۔ محبوب سے جب اس نے کہا کہ اگر کہو تو میں تمہارے لیے گولیاں بھی کھا سکتا ہوں تو محبوب نے غصے میں آ کر کہا ''کھاؤ'' تو جھٹ سے موصوف نے پیناڈول کی گولیاں کھا کر دکھا دیں۔ ایسے ہی نکھٹو عاشقوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

وصل ہو یا فراق ہو اکبر
جاگنا ساری رات مشکل ہے

بعض عاشق شعروادب سے لگاؤ رکھتے ہیں اس لیے ان کی باتیں بھی ادبی

ہوتی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کو قیامت کہتے ہیں جو ہمارے نزدیک سراسر محبوب کی بے ادبی ہے کیونکہ قیامت تو ہر ایرے غیرے پر بھی آئے گی اور اکثر شادی ہو جانے کی صورت میں ان عشاق کی یہ پیشین گوئی سو فیصد درست ثابت ہوتی ہے اور وہ واقعی ''قیامت'' ہی ثابت ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں کو حالات حلیۂ عاشق بنا دیتے ہیں یعنی اگر کسی کے ہاں مہمان بہت آئیں تو میزبان بے چارہ بعد ازاں بجٹ متوازن رکھنے کے لیے شیو چھوڑ دے، کپڑے ایک ہی دفعہ استری کرے تو اس کا کیا قصور! مگر نتیجے میں وہ عجیب الخلقت عاشق نما مخلوق دکھائی دینے لگتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں ان حضرت کو عشق ہو گیا ہے مگر اُسے تو مہمان ہو گیا ہوتا ہے اور وہ رو رو کر سب سے کہتا پھرتا ہے:

ع یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

کچھ عشاق کے عشق کے پیچھے مادی مقاصد کارفرما ہوتے ہیں اور محبت کا مقداری جائزہ ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ جمع وتفریق کا حساب ہمہ وقت ان کے پیشِ نظر رہتا ہے۔ محبوب سے محبت کے بارے میں پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم مجھ سے کتنے فی صد محبت کرتی ہو؟ یہ وہ عاشق ہوتے ہیں جو محبوب کو مالٹا دے کر جواباً گرما کا تقاضا کرتے ہیں۔ ایسے لوگ عشق تو نہیں البتہ غبن کامیابی سے کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ عاشق کم اور فاسق زیادہ لگتے ہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ اور ماڈرن دور میں کچھ ایسے کمپیوٹرائزڈ عاشق بھی دریافت ہوئے ہیں جو ایک ہی دِن میں دو دو ''ڈیٹیں'' لگا کر کیلنڈر کو شرمسار کرتے ہیں حالانکہ خود وہ کبھی اس کیفیت سے نہیں گزرے۔

کہتے ہیں سولہ سالہ عشق اور ساٹھ سالہ عشق ایک برابر ہوتا ہے۔ اسی لیے مرضِ عشق کئی بوڑھوں کو بھی آ گھیرتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بوڑھے بیٹھے ہوں تو ان کا سر جھولتا رہتا ہے جو نوجوان عشاق کے لیے ایک سبق ہوتا ہے جسے وہ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

یہ بیمار تو پہلے ہی ہوتے ہیں اس پر عشق سونے پر سہاگے کا کام انجام دیتا ہے اور جب کچھ بن نہیں پڑتا تو عشق کا مرض نزلے کی طرح اپنی مدت پوری کر کے خود ہی ٹھیک ہو جاتا ہے۔ تاہم مرض کے دوران میں انہیں ناتوانیِ جاں کے سبب کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

بیماری کی صورت میں ڈاکٹر کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا ہے مگر ڈاکٹر اس بات کا اندازہ لگانے میں ناکام ہو جاتے ہیں کہ یہ علامات کون سی بیماری کی ہیں؟ اور بغرض تسلی وہ گلوکوز پلانے کی تلقین کرتے ہیں اور کڑوی کسیلی دوائیں پینے کو دے دیتے ہیں۔ چنانچہ مرتے کیا نہ کرتے کے مصداق ان ''بڈھے عاشقوں'' کو یہ دوائیں عشق کا ثمرہ جان کر پینا پڑتی ہیں۔ کچھ شوقین مزاج بڈھے عاشق دِل کی تشفی کے لیے ہر دوا سے پہلے یہ گانا فرض سمجھتے ہیں:

جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
میں نے احسان طبیبوں کا اُٹھا رکھا ہے

پی گیا ہوں میں دوائیں سبھی ہنس کر ظالم
عشق میں ربّ نے مرے کیسا مزہ رکھا ہے

ہم تو اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عاشق نوجوان ہو یا بوڑھا دراصل ناکامیاں اور مصائب ہی اس کا مقدر ہیں۔ عشق روگ ہی ایسا ہے۔ عشق کامیابی و شادی کی منزل پا کر بھی جب جنگ و جدل میں بدلتا ہے تو عاشق کو ناکامی کا احساس اس بُری طرح ستاتا ہے کہ اسے اپنے عشق پر رونا آتا ہے اسی لیے تو کہتے ہیں:

''براتِ عاشقاں برشاخِ آہو''

ooo

''کُریدتے ہو جو اب راکھ''

ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہ پر پوری امریکی قوم چراغ پا ہے۔ اب تو ایسے لگتا ہے کہ غصے کی وجہ سے ان کی عقل بھی زیر پا ہے۔ جارج بش بپھرے ہوئے شیر کی طرح دھاڑ رہے ہیں اور صلیبی جنگوں کے نئے آغاز کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ شاید عقل کے ساتھ ساتھ تاریخ کے علم سے بھی پیدل ہیں ورنہ انھیں صلیبی جنگوں میں رچرڈ شیر دل جیسے سپہ سالار کی صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں تباہی و بربادی سے اور یروشلم (بیت المقدس) سے عیسائی افواج کی پسپائی کی عبرتناک داستان سے اُلٹے کان پکڑنے چاہئیں اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کو اپنی بدا عمالیوں اور ستم شعاریوں کا شاخسانہ سمجھ کر صبر کر لینا چاہیے ویسے بھی ابھی

ع مقاماتِ آہ وفغاں اور بھی ہیں

بش صاحب ببر شیر کی طرح چنگھاڑ تو رہے ہیں لیکن مجھے اُمید ہے کہ ان کا

حال بھی اس شیر کی طرح کا ہوگا جسے جنگل کا بادشاہ ہونے کا خبط کچھ زیادہ ہی تھا اور ایک دن اسی نشے کی ترنگ میں جنگل کے چھوٹے بڑے کمزور دِل جانوروں کو آنکھیں نکال نکال کر اپنے بادشاہ ہونے کی تصدیق کروا رہا تھا۔ گیدڑ، لومڑی اور کئی ایک دوسرے جانوروں سے جب شیر نے اپنے جنگل کا بادشاہ ہونے کی تصدیق ایک ہی دھاڑ سے لے لی تو اس کا حوصلہ آسمان کو چھونے لگا۔

وہ آگے بڑھا تا کہ اپنے بادشاہ ہونے کی اور اسناد حاصل کر سکے۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک ہاتھی اپنی مستی میں کھڑا ہے۔ شیر اس کے قریب پہنچا اور دھاڑ کر اس سے پوچھا ''بتاؤ اس جنگل کا بادشاہ کون ہے؟'' ہاتھی کو اپنے آرام میں یہ مداخلتِ بے جا پسند نہ آئی اور اس نے شیر صاحب کو اپنی سونڈ میں اُٹھایا اور درخت کے تنے پر دے مارا۔ شیر صاحب کراہتے ہوئے اور بدن سے گرد جھاڑتے ہوئے اُٹھے اور فرمایا ''یار اگر نہیں پتا تھا تو مجھ سے پوچھ لیتے اس طرح غصہ کرنے سے کیا فائدہ۔''

صدر بش کے ساتھ ساتھ آج کل امریکی فوجی بھی خاصے پریشان ہیں کیونکہ انھوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ انھیں کبھی جنگ بھی لڑنا پڑے گی لیکن اُمید ہے کہ اب ان کی تنخواہیں بھی حلال ہوں گی۔ امریکی فوجی اس پریشانی کے عالم میں اپنی اور عادتاً دوسروں کی بیویوں سے بھی گلے مِل مِل کر رو رہے ہیں کیونکہ آج کل انھیں خواب میں بھی افغان پٹھان ہی نظر آ رہے ہیں خواہ وہ ''سکھ'' ہی کیوں نہ ہوں۔

امریکی بھی کمال قوم ہیں۔ ان کے انتہا پسند سپوتوں نے ایک ''سکھ'' کو افغانی سمجھ کر مار دیا۔ جب بی بی سی والوں نے اس کے گھر والوں سے انٹرویو لیا تو اس

کے باپ نے کہا کہ ''میرے پت نوں بس داڑھی مروا گئی۔''

امریکہ الزام لگا رہا ہے کہ یہ حادثہ افغانیوں نے کیا ہے جب کہ ایک افغانی سے جب یہ پوچھا گیا کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون آپ لوگوں نے تباہ کیے ہیں تو اس نے بڑی حیرت سے کہا ''اوخوچے یہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون کہاں ہیں۔''

معلوم ہوا ہے کہ امریکی فوجیوں نے اپنے گھر والوں سے کہا ہے کہ ''عمر'' نے وفا کی تو پھر ملیں گے لیکن ''عمر'' نے کس سے وفا کی ہے۔

امریکی ان دِنوں جہاز پر سفر نہیں کرتے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ وہ اُوپر سے مزید اُوپر چلے جائیں۔ اگر یہی صورتِ حال رہی تو اُمید ہے کہ پھر ان کے بچے ہی جہازوں سے کھیلیں گے اور امریکی پائلٹ صرف پتنگیں اُڑائیں گے اور اب ان کا یقین کامل ہو گیا ہے کہ یہ ہوائی جہازوں کی کمائی بھی ''ہوائی روزی'' ہی ہے۔ اس طرح ابرار الحق کا یہ گانا واقعی درست ثابت ہوگا کہ ''بہ جا سائیکل تے''

ان دِنوں اگر کسی امریکی کے جسم پر پھوڑے پھنسیاں بھی نکلتی ہیں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی اُسامہ بن لادن کا حیاتیاتی حملہ ہے خواہ وہ پھوڑے پھنسیاں ان کے اندر کی غلاظت کے باعث ہی کیوں نہ ہوں۔

آج کل امریکہ ہر ملک سے جنگی امداد مانگ رہا ہے کبھی کسی ملک سے اڈے مانگتا ہے تو کبھی کسی سے۔ اڈوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ پریشان ''نیو خان'' کے ڈرائیور ہیں جن کا مؤقف یہ ہے کہ اگر اڈے امریکہ کو دے دیئے تو ہم بسیں کہاں کھڑی کریں گے۔ اس کے علاوہ کچھ اور ''اڈوں'' پر بھی خوف کی لہر دوڑ گئی ہے اور

وہاں بھی لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ کچھ کم ہو گیا ہے۔ یہ تو خدا کا شکر ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر امریکہ میں ہے اگر پاکستان میں ہوتا تو کب کی ڈبل سواری پر پابندی لگ چکی ہوتی۔

کہتے ہیں ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے'' اب امریکہ ظاہر شاہ کو ظاہر کر رہا ہے جو کئی سال سے چھپا ہوا تھا اب اس کو امریکہ ظاہر کر کے نجانے کیا ظاہر کرنا چاہتا ہے لیکن اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے اقبال نے پہلے ہی کہہ دیا تھا:

ع اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا

امریکی حکومت نے ''اُسامہ بن لادن'' کی گرفتاری میں مدد دینے والے کے لیے کئی ملین ڈالر انعام میں دینے کا اعلان کر رکھا ہے۔ پیسہ کسے اچھا نہیں لگتا؟ ہمیں بھی یہ شوق چرایا ہم نے بھی اُسامہ ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دی کئی ایک اُسامے ہاتھ بھی لگے لیکن کسی کی بھی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔ دراصل آج کل جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے اس کے گھر والے اس کا نام اُسامہ ہی رکھتے ہیں اور جس شرح سے ماشاءاللہ یہاں بچے پیدا ہوتے ہیں اس حساب سے اُمید ہے کہ آئندہ چند برسوں میں یہاں اُسامہ نامی بچوں کی اچھی خاصی کھیپ تیار ہو جائے گی۔

اس طرح ''اُساموں'' کے اس پراجیکٹ سے ہمارا ملک بھی امیر ہو جائے گا کیونکہ اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ ہمیں تو ایسے لگتا ہے کہ مستقبل میں امریکی حکومت کو دُنیا سے ''اُسامے'' ختم کرنے کے لیے کوئی ویکسین تیار کرنا پڑے گی۔

امریکہ میں تو اب ہر کوئی اُسامہ کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہاں اگر کوئی کسی کے گھر جا کر یہ کہے میں ''خانساماں'' ہوں دروازہ کھولیے تو گھر والے دروازہ کھولنے کے بجائے چارپائی کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔

امریکہ جو خود اتنا بڑا دہشت گرد ہے کہ دوسرے ممالک اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچے اب دُنیا میں دہشت گردی ختم کرنے کے درپے ہے اور خوردبین لگا کر دہشت گرد تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ امریکہ میں ہونے والے اس واقعہ سے پہلے بھی کشمیر اور فلسطین میں مسلمان مر رہے تھے اور مر رہے ہیں لیکن وہاں اسے دہشت گرد نظر نہیں آئے اور نہ ہی ظلم نظر آیا لیکن جب اپنے ملک میں ایسا واقعہ پیش آیا تو اس کو دہشت گردی یاد آ گئی اور ہر طرف اس کو دہشت گرد دکھائی دینے لگے۔ اس کی مثال تو ویسی ہے کہ ایک صاحب کی ٹانگ ٹوٹ گئی ڈاکٹر نے پوچھا:

''آپ کو کتنا درد محسوس ہوتا ہے۔''

مریض نے جواب دیا ''تمہاری ٹانگ کبھی ٹوٹی ہے۔''

ڈاکٹر نے کہا ''نہیں''

مریض نے کہا ''تو پھر میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ میری ٹانگ میں کتنا درد ہو رہا ہے۔''

اب بندہ امریکہ سے پوچھے کہ کشمیر یا فلسطین میں مسلمانوں پر جو گولیاں چلائی جا رہی ہیں کیا ان لوگوں کے جسم سٹیل کے بنے ہوئے ہیں یا ان کو موت نہیں آتی یا تکلیف نہیں ہوتی واہ رے امریکہ تیری کون سی کل سیدھی چور بھی کہے چور چور

چوروں سے خبردار رہیے!

اس واقعہ کے سلسلے میں پورا امریکہ اور یورپ جامے سے باہر ہو گیا ہے اگرچہ وہ عام حالات میں بھی باہر ہی رہتے ہیں۔ یہ لوگ شاید فطرت کو قریب سے نہیں دیکھتے اور نہ ہی فطرت کو پسند کرتے ہیں سوائے فطری لباس کے۔

ان دِنوں سارے عیسائی اور یہودی پاگل ہوئے پھرتے ہیں۔ (اگرچہ وہ پہلے ہی تھے) اور یہ پاگل بھی وہ ہیں جو گھر کی اشیاء باہر نہیں لے کے جاتے بلکہ باہر کی گھر لے کے آتے ہیں۔ ان ممالک کے سربراہان کئی ممالک کے دورے کر رہے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ ان کو دورہ پڑا ہوا ہے۔ یہ اتحادی جنھیں فسادی بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا یہ اتحاد کر کے دوسرے غریب ممالک کو برباد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب بھی غریب ممالک میں دہشت گردی ہوتی ہے تو وہ نہ تو اس کے سدِباب کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں اور نہ ہی مجرموں کو سزا دینے کی کوشش کرتے ہیں محض اس کی مذمت ہی کرتے رہ جاتے ہیں اور مجرموں کو انسانی حقوق دِلوا کر رہا کروا دیتے ہیں۔

امریکہ کا ''سرمایہ'' دارانہ نظام جس کی چکاچوند سے وہ غریب ممالک کی آنکھوں کو خیرہ کیا کرتا تھا۔ گیارہ ستمبر کو خود بھینگا ہو گیا اسی لیے اب مسلمانوں کو ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ رہا ہے مگر ان کو یہ بات بھی دھیان میں رکھنا ہوگی کہ غیور پٹھانوں کے بچے نشانے میں اتنے تاک ہیں کہ غلیل سے بھی آنکھیں پھوڑ ڈالیں گے۔۔۔!

ooo

لاٹھی چارج

کسی انگریز نے کیا خوب کہا تھا ''Might is right''، یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ پاکستانی وفادار قوم ہے اس لیے اپنے پرانے حاکموں سے وفاداری کے ثبوت میں انگریزوں کے اس مقولہ پر بڑے خضوع وخشوع سے عمل پیرا ہیں۔ اگر کوئی اس پر عمل نہ کرے تو لوگ اسے یہ طعنہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

''توں کی جانے بھولیے مجھے ''انارکلی'' دیاں شاناں۔''

خواص اس اَمر پر متفق ہیں کہ ان متنوع اقسام کی بھینسوں کو معاف کیجیے گا لوگوں کو ہانکنے کے لیے لاٹھیاں بھی طرح طرح کی ہونی چاہئیں۔ کبھی مہنگائی کی شکل میں، کبھی بل کی صورت میں اور کبھی ٹیکس کے نام پر لاٹھیاں غریب آدمی کو برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ اگر یہ لاٹھیاں اسی طرح مسلسل چلتی رہیں تو اُمید ہے کہ آئندہ چند برسوں میں غریب یہاں بالکل ہی ''مُک'' جائیں گے۔

پہنچ والے لوگ بھی کمال شے ہیں۔ لاٹھی کو لاٹھی سے ہی روک لیتے ہیں اور پھر معاشرے میں ان کی قدر و قیمت مہنگائی کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایسے لوگ معاشرے میں آئیڈیل کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے کان غریبوں کی آہ و پکار کا میوزک سن کر محظوظ ہوتے ہیں اور غریبوں کی بے کسی کی فلم دیکھ کر ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔

یہاں ہر غریب باپ کی یہ خواہش ہے کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر ''بڑا آدمی'' بنے اس کے پیچھے وہی سوچ کارفرما ہے جس کے تحت چھابڑی والا اپنے بیٹے کو مڈل پاس کرواتا ہے تاکہ وہ سپاہی بن کر اس کی چھابڑی کو کمیٹی والوں کی دسترس سے بچا سکے۔ یوں لاٹھیوں کا کھیل عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

ماشاءاللہ پاکستان میں لاٹھیوں کی کمی نہیں بلکہ ''لاٹھیاں والا'' کے نام سے پورا شہر آباد ہے۔ ان لاٹھیوں کی کئی قسمیں ہیں۔ ہر عضو کو متاثر کرنے کے لیے الگ لاٹھی ہے۔ ان لاٹھیوں میں سے ایک پولیس کی لاٹھی بھی ہے جس سے ہر شریف انسان ڈرتا ہے اور یہاں شاید صرف ڈرایا بھی انھیں کو ہی جاتا ہے۔

ایک دفعہ پروفیسروں کے ایک جلوس کو منتشر کرنے کے لیے اندھا دھند لاٹھی چارج کیا گیا۔ اس دوران میں کسی من چلے سپاہی کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا گیا۔ ''او یار کناں ''جالاں'' نال واپے گیا اے۔'' شاید اسی لیے ایک پروفیسر صاحب نے فرمایا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی جہنم میں نہیں جائے گا کیونکہ وہ اس سے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہو سکتی۔

ایک لاٹھی بیوروکریسی کی بھی ہے جس کو لگتی ہے اس کی کمر توڑ دیتی ہے۔

ڈاکٹرز کا کہنا ہے پاکستان میں کمر کی تکلیف شاید اس کی وجہ سے زیادہ ہے۔

ایک بیوروکریٹ کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہوا۔ جب وہ چارج لینے دفتر پہنچا تو اس کی نظر ڈسچارج ہونے والے بیوروکریٹ کی فائل پر پڑی۔ اس نے ایک سوئمنگ پول بنانے کی محض کاغذی کارروائی پر لاکھوں روپے ہتھیا لیے تھے۔ نئے آنے والے بیوروکریٹ نے اپنے پیش رو کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس سوئمنگ پول کو نامناسب جگہ پر سے ختم کرنے کے لیے مزید لاکھوں روپے کے بجٹ کا تخمینہ لگا لیا حالانکہ یہ سوئمنگ پول محض کاغذوں میں ہی بنا اور کاغذوں میں ہی مٹا دیا گیا۔ واہ ری بیوروکریسی تیرا کیا کہنا! کیسی تاک کے لاٹھی گھمائی!

اسی طرح ایک لاٹھی فوج کی بھی ہے جو مختلف محکموں میں بدعنوانی کی اطلاعات موصول ہونے پر وہاں فوج کو تعینات کر دیتی ہے اس لیے محکموں والے فوج کی لاٹھی سے بہت ڈرتے ہیں کیونکہ یہ لاٹھی فوری اثر دِکھاتی ہے۔ مختلف محکموں کے لوگ اس لاٹھی سے ایسے ڈرتے ہیں جیسے ماڈرن شوہر بیوی سے۔ اس کی اہمیت بھی لاٹھیوں میں وہی ہے جو دواؤں میں اینٹی بائیٹک دوا کو حاصل ہے۔

ریلوے کا محکمہ بھی پٹڑی سے اُتر رہا تھا۔ جب انھیں پتا چلا کہ فوج مداخلت کرنے والی ہے تو افسروں نے پہلے تو کاغذوں میں منافع دکھایا اور پھر ہاتھ دِکھا گئے۔

ریلوے کا ایک بڑا افسر جب حمام میں بال بنوانے جاتا تو حجام اس سے کم از کم دو مرتبہ یہ ضرور پوچھتا کہ جی سنا ہے ریلوے میں بھی فوج آ رہی ہے۔ افسر نے

تنگ آ کر اسے کہہ دیا کہ آخر ہر بار تم مجھ سے ہی یہ سوال کیوں دُہراتے ہو۔ حجام نے کہا! جب میں فوج کا نام لیتا ہوں تو آپ کے سارے بال کھڑے ہو جاتے ہیں اور اس طرح مجھے بال بنانے میں آسانی رہتی ہے۔

کچھ لاٹھیاں غیر محسوس طریقے سے اثر انداز ہوتی ہیں جیسے میڈیا کی لاٹھی، جس طرح ہماری حکومت اور عوام ظالم و مظلوم ہیں اسی طرح ہماری حکومت اور میڈیا لازم و ملزوم ہیں۔

ایک لاٹھی جمہوریت کی بھی ہے جو اس بے ڈھنگے پن سے استعمال کی گئی کہ اپنے خواص کھو بیٹھی اور آج اس صورت میں ہمارے سامنے ہے کہ:

"Democracy is the Government "off" the People "buy" the People "far" the People"

ہمارے ملک میں ایک لاٹھی محکمہ خوراک کی بھی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں سب سے بھوکا محکمہ بھی یہی ہے۔ یہ محکمہ اس لیے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ یہ قوم ''کھانے'' سے بڑی رغبت رکھتی ہے۔ یہاں کچھ لوگ تو مرغوں کی ٹانگیں کھاتے ہیں اور کچھ صرف لاتیں۔ اسی طرح کچھ لوگ تو کولڈ ڈرنکس پیتے ہیں اور کچھ بے چارے ''ستے'' ہوئے لوگ صرف ''ستو'' پر ہی گزارا کرتے ہیں۔

کچھ لاٹھیوں کا رواج اب کم ہو رہا ہے۔ پہلے دولہا کے ہاتھ میں لاٹھی ہوتی تھی اب باجے والوں کے پاس ہوتی ہے مگر بے چارے یہ اس سے کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ صرف لاٹھی دِکھاتے ہیں چلاتے نہیں۔

ایک لاٹھی ماسٹر کے پاس بھی ہوتی ہے جو اب اس کے ہاتھ سے سرک رہی

ہے اور طالبِ علم کے ہاتھ میں آ رہی ہے۔ اسی لیے تو ماسٹروں کے مائنڈ اب ''ماسٹر مائنڈ'' نہیں رہے بلکہ ڈزاسٹر مائنڈ (Disaster Mind) بن گئے ہیں۔

ایک لاٹھی بوڑھے بابوں کے پاس ہوتی ہے جو انھیں چلاتی ہے کیونکہ بابے اس عمر میں لاٹھی چلا نہیں سکتے۔

ان بابوں اور بینڈ والوں کی لاٹھی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں مگر دوسری تمام لاٹھیاں خدا کرے ٹوٹ جائیں۔ اگر یہ نہ ٹوٹیں تو پہلے کی طرح پاکستان ٹوٹ جائے گا۔ (اللہ نہ کرے)

فی الحال تو لاٹھیاں ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہیں صرف لاٹھی چلانے والے ہاتھ بدلتے رہتے ہیں لاٹھی وہی پرانی رہتی ہے اور یہ لاٹھیاں ہیں بھی اتنی تگڑی کہ بقول شاعر:

ع اِن ''لاٹھیوں'' سے کون نہ مر جائے اے خدا!

ہم تو پھر وہ ناتواں عوام ہیں جو پھونک مارے سے بھی مر سکتے ہیں!

○○○

''اشتہاری'' ٹی وی

''پاکستان میں ہر شے دو نمبر ہے حتیٰ کہ میڈیا میں بھی یہ رواج ہو چکا ہے جیسے ''PTV1'' اور ''PTV2'' وغیرہ۔''

ہمارا ٹی وی ماشاء اللہ اتنی ترقی کر گیا ہے کہ رنگین تو رنگین اب تو بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پر بھی ''رنگین'' پروگرام نظر آتے ہیں۔ خاص طور پر آج کل ٹی وی پر جو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان میں شاید کپڑے کا فقدان ہے۔ پچھلے دنوں ایک اداکارہ سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا آپ کوئی خاص لباس پسند کرتی ہیں؟ تو اُس نے یہ جواب دیا کہ میں لباس کوئی خاص پسند نہیں کرتی۔

ہمارا ٹی وی یورپ کا مقابلہ کر رہا ہے فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ٹی وی نے لوگوں کے مزاج بدل دیئے ہیں اور یورپین ٹی وی نے لوگوں کے مجازی خدا۔ اسی طرح ہمارے ٹی وی اور زی ٹی وی میں یہ فرق ہے کہ یہ ''سری نگر'' دِکھاتے ہیں اور وہ

''سری دیوی''۔ویسے تو لوگ ڈِش سے بھی ذائقہ بدلتے رہتے ہیں۔کبھی ''بی بی'' دیکھتے ہیں تو کبھی ''بی بی سی'' تاہم کیبل کی تو کیا ہی بات ہے۔ایک ٹکٹ میں ۸۰ چینل۔ ٹی وی نے لوگوں کے مزاج کو بھی متاثر کیا ہے۔

ابھی کل ہی ٹی وی پر عارف لوہار گا رہا تھا دُور سے ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے عارفہ صدیقی گا رہی ہے لیکن بعد میں اس کا چمٹا دیکھا جو ہمیشہ اس کے ساتھ چمٹا رہتا ہے تو پتا چلا کہ یہ تو عارف لوہار ہے۔اسی طرح شازیہ منظور کو دیکھا تو پہلے پہل منظور جھلا ہی لگا اور بالکل یہی صورتِ حال عابدہ پروین کو دیکھ کر ہوتی ہے یعنی دُور سے عابد حسین ہی لگتا ہے حالانکہ گانا بجانا عابدوں کا کام نہیں ہے۔اس کے علاوہ ہمارے ٹی وی نے لوگوں کے مزاج کو شارٹ کٹ پسند بنا دیا ہے۔جیسے لوگ سیّد نور کے بجائے صرف ''نور'' کو ''احمد عقل روبی'' کے بجائے صرف ''روبی'' کو ''شاہراہِ ریشم'' کے بجائے صرف ''ریشم'' کو اور اقبال کے شاہین کے بجائے ''مسرت شاہین'' کو پسند کرتے ہیں اور تو اور ٹی وی پر اسلام کے بجائے امجد اسلام امجد زیادہ نظر آتا ہے۔

مذہبی شوق ناظرین میں اتنا زیادہ ہے کہ جب اذان ہوتی ہے تو اکثر لوگوں کو بھولے کام اس وقت یاد آتے ہیں۔مثلاً جب ظہر کی اذان ہوتی ہے تو لوگ نماز کی فکر نہیں کرتے بلکہ گھڑی کی طرف دیکھ کر سٹپٹا کر کہتے ہیں کہ اُف! ظہر ہو بھی گئی۔ پاکستانی ٹی وی کی مثال بھی ہماری زندگی جیسی ہے جیسے پیدائش کے وقت کان میں اذان دیتے ہیں اور موت پر نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں اور اس وقفے کے درمیان نہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ہمارا ٹی وی بھی بالکل ایسے ہی ہے یعنی آغاز تلاوتِ کلام

پاک سے کرتے ہیں اور اختتام دُعا پر کرتے ہیں اور درمیانی وقفے میں۔۔۔پاکستانی ٹی وی ثقافت کے نام پر کثافت ہی پیش کرتا ہے۔

بعض ناظرین بھی بہت بھولے بھالے ہوتے ہیں مثلاً جب اناؤنسر کہتی ہے کہ ناظرین آئیے اب آپ کو لاہور لیے چلتے ہیں تو وہ اس سفر کے ڈر سے ٹی وی بند کر دیتے ہیں۔

ہمارا ٹی وی غریب عوام کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ اس کی ماندگی میں اضافہ کرتا ہے جیسے اب جتنے ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں۔ان میں سیٹ اتنے قیمتی ہوتے ہیں کہ عوام اسے دیکھ کر ''اَپ سیٹ'' ہو جاتے ہیں۔

عوام کو صرف الیکشن کے دِنوں میں دِکھایا جاتا ہے یا کسی جلسے جلوس میں جہاں ان بے چاروں کا جوس نکلتا ہے اور پولیس ان پر لاٹھی چارج کرتی ہے اور ہمارے ملک میں ویسے بھی عوام کو لاٹھی سے ہی چارج کیا جاتا ہے۔

کبھی کبھی کشمیر کے پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں جیسے ''کشمیر جنت نظیر'' لیکن کسی دَور میں ''جنت'' کے جائے صرف ''بے'' سے ہی کام چلایا جاتا تھا اور کبھی ٹی وی پر ''شرفا'' بھی چھا جاتے ہیں جیسے نواز شریف یا بابرہ شریف وغیرہ۔

جو خواتین کشمیری پروگرام پیش کرتی ہیں۔وہ کشمیر میں ہونے والے مظالم بتاتی ہیں حالانکہ ان کا اپنا حلیہ ظلم کرنے والا ہوتا ہے۔

جو بچوں کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں ان میں بڑوں والی باتیں بتائی جاتی ہیں جیسے جھوٹ نہ بولیں یا کسی کے ساتھ زیادتی نہ کریں، جو بڑوں کے پروگرام

پیش کیے جاتے ہیں ان میں بچوں کی باتیں بتائی جاتی ہیں جیسے ''بچے دو ہی اچھے'' وغیرہ۔ بعض لوگوں کے واقعی دو ہی بچے اچھے ہوتے ہیں پندرہ سولہ میں سے۔

اب تو ٹی وی پر وزارتِ بہبودِ آبادی والے سبز ستارہ کا نشان دِکھاتے ہیں اگر عوام اس سے بھی نہ مانے تو اگلی بار دم دار ستارہ دِکھایا جائے گا۔

اس کے علاوہ ٹی وی پر پاپ سنگر اکثر پاپ کرتے نظر آتے ہیں اور پہلے پہل تو انھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ''سکھ'' ہیں لیکن بعد میں پتا چلتا ہے کہ نہیں ابھی شاید یہ ''سکھ'' رہے ہیں۔ ان کو سن کر تو کوؤں نے بھی اپنی آواز پر رشک کرنا شروع کر دیا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ خود کم گاتے ہیں بلکہ سامعین سے کہتے ہیں کہ ''میرے ساتھ مل کر گائیے'' بندہ پوچھے اگر انھیں گانا آتا تو پھر تمھیں کیوں بلاتے۔

ان لوگوں نے حتیٰ کہ اقبال کے کلام کو بھی نہیں بخشا انھوں نے شاید ''اقبال'' کو ''اِک بال'' سمجھ رکھا ہے:

ع کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

اسی طرح بابا بلھے شاہ کا کلام جیسے ''بلھیا کی جاناں میں کون'' اس کو ایک صاحب گانے کی کوشش کر رہے تھے اور درمیان میں ایک اداکارہ دِکھار ہے تھے۔ جس کا پیٹ عریاں تھا۔ وہ شاید جواز کے طور پر اس لیے دِکھار ہے تھے کیونکہ بابا بلھے شاہ کو بھی پیٹ کی بالکل پرواہ نہیں تھی اور یہ جو اداکارائیں ہوتی ہیں یہ ویسے بھی پیٹ کی کچی ہوتی ہیں اور یہ سب جتن پیٹ کے لیے ہی کرتی ہیں۔ عموماً اداکارائیں خصوصاً اس قول پر عمل پیرا ہوتی ہیں کہ: ''پہلے پیٹ پوجا پھر کام دوجا''

ہمارے ایک دوست ''مڈایسٹ ٹائم'' کا صرف آغاز کا حصہ دیکھتے ہیں کیونکہ وہ صرف یہ سن کر خوش ہوتے ہیں کہ جب ثناء آتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ ''ہائے میں ہوں آپ کی ثناء''۔ اس کے بعد وہ ٹی وی بند کر دیتے ہیں۔ بعض پروگراموں میں کمپیئر کہتے ہیں کہ ''ملتے ہیں بریک کے بعد''۔ اکثر اوقات ان کی بریک بھی لوکل بسوں جیسی ہو جاتی ہے۔ ٹی وی پر اشتہارات اتنے دِکھائے جاتے ہیں کہ اب تو ٹی وی بھی اشتہاری سا لگنے لگا ہے۔ ان اشتہارات کی بھی کئی قسمیں ہیں۔

بعض اشتہارات بالکل ادھورے ہوتے ہیں جیسے ایک اشتہار میں کہا جاتا ہے کہ اب کراچی سے کشمیر تک گائے ہی گائے اور یہ نہیں بتایا جاتا کہ کون گائے۔

بعض میں صاف دھوکہ دیا جاتا ہے۔ جیسے لیمن میکس کے اشتہار میں ایک خاتون کہتی ہے کہ میں آ رہی ہوں آپ کے گھر لیکن وہ بڑی ہوشیار ہے جاتے جاتے یہ بھی کہہ دیتی ہے کہ اگلی بار میں آ رہی ہوں آپ کے گھر لیکن اس کے وعدے بھی کالا باغ ڈیم جیسے لگتے ہیں۔ بعض اشتہارات کا فائدہ بھی ہوتا ہے جیسے ویوز کا اشتہار اس کا فائدہ ایک خاوند نے اُٹھایا (اگرچہ بعد میں پھر اوروں نے بھی اُٹھایا) وہ یوں کہ اس کی بیوی نے کہا کہ سر تاج ویوز ٹرپ لٹ فریز رلا دو تو خاوند نے بڑے دھڑلے سے کہا کہ بیگم ''ویوز بس نام ہی کافی ہے۔''

بعض اشتہارات بالکل سچے ہوتے ہیں جیسے K2 سگریٹ والے کہتے ہیں کہ ''K2 سگریٹ ہمیشہ کا ساتھ''۔ وہ شاید اس لیے کہ انھیں گمان ہے کہ اگلی دُنیا میں بھی K2 ملے گا لیکن وہاں سہولت یہ ہوگی کہ ماچس یا لائٹر کی ضرورت نہ ہوگی۔

کچھ اشتہارات بالکل جھوٹے ہوتے ہیں جیسے بائیو آملہ والے کہتے ہیں کہ ہم آپ کے ''بالوں'' کو بہتر جانتے ہیں حالانکہ وہ خود اتنے مصروف ہیں کہ اپنے ''بالوں'' کو بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

اکثر اشتہارات جھوٹ اور سچ کا آمیزہ ہوتے ہیں جیسے ایک اشتہار میں کہتے ہیں کہ ''سونے کی بارش'' حالانکہ یہ سونا دیتے نہیں بلکہ عوام کے ضمیر کو سلاتے ہیں ویسے بھی اس ملک میں امیر لوگ ''کان'' میں سے سونا اور غریب میل برآمد کرتے ہیں۔ان کی مثال بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک صاحب کا رشتہ طے ہونا تھا تو لڑکی کے گھر والوں نے پوچھا کہ لڑکا کیا کرتا ہے تو گھر والوں نے بتایا کہ وہ سونے کا کام کرتا ہے شادی کے بعد پتا چلا کہ موصوف تو دِن رات سوتے ہی رہتے ہیں۔

اِس کے علاوہ ٹی وی پر ایڈز سے بچاؤ کا اشتہار بھی دِکھاتے ہیں افسوس کہ ہم نے ''ان سے'' ایڈ لیتے لیتے ''ایڈز'' بھی لے لی ہے۔

اب تو ہمارے عوام بھی ایڈ کے شوقین ہو گئے ہیں کیونکہ ان بے چاروں کو ایڈ تو نہیں ملتی البتہ اپنا دِل بہلانے کے لیے بی ایڈ اور ایم ایڈ وغیرہ کر لیتے ہیں۔ٹی وی پر امپورٹڈ چیزوں کے اشتہارات زیادہ دِکھائے جاتے ہیں جو عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہیں حالانکہ عوام کی حالت کے مطابق اشتہار دِکھانے چاہئیں جیسے ریولون کے بجائے صرف ''لون'' کا یا ''ہنی کیئر رس'' کے بجائے صرف ''رس'' کا اشتہار دِکھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ٹی وی پر ''خشک سالی'' سے بچاؤ کے لیے عوام سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ بارش کی دُعا کریں اس پر ایک دُور اندیش بزرگ (جو بڑی دُور سے آواز سن لیتے ہیں

لیکن ٹیلی فون پر اور بڑی دُور تک دیکھ سکتے ہیں لیکن دُوربین سے) فرما رہے تھے کہ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی ''سالیاں'' دیکھی ہیں لیکن یہ ''خشک سالی'' پہلی بار دیکھی ہے۔کچھ اشتہارات میں لائف ٹائم گارنٹی یوں دی جاتی ہے جیسے موت کا فرشتہ ان کا واقف ہو۔جیسے ایک اشتہار میں کہا جاتا ہے کہ ''لائف ٹائم گارنٹی'' کے ساتھ اگرچہ اب ہماری لائف میں ''F'' کا حرف ہی نہیں رہا۔

ہمارا ٹی وی باطن کے بجائے ظاہر پر زیادہ زور دیتا ہے اور اس طرح لالچ اور ہوس کی حکمرانی ہو رہی ہے جیسے پیپسی کے اشتہار میں بھی لالچ نظر آتا ہے یعنی لڑکی دِکھا کر آخر میں لکھ دیتے ہیں کہ ''دِل مانگے اور''

خبروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو خبروں میں کبھی ''چور'' دِکھاتے ہیں تو کبھی ''کام چور'' کیونکہ یہ ملک چوروں میں خود کفیل ہے۔اس کے علاوہ خبروں میں جو سیاسی رہنما آپس میں ''مذاق رات'' کرتے ہیں وہ دِکھاتے ہیں۔

خبروں میں امریکہ اور یورپ کا ذِکر تقریباً اتنی دفعہ ہی ہوتا ہے جتنی دفعہ قرآن میں شیطان کا۔خبروں میں جو جھوٹ بولا جاتا ہے وہ بھی رنگین ہی ہوتا ہے بالکل اسی طرح جیسے دو بے وقوف جھوٹ کا مقابلہ کر رہے تھے۔ایک نے کہا کہ میرے ابا جان نے ایک ہی وقت دس بندے پھڑکا دیئے تھے۔دوسرے نے کہا یہ کون سی بڑی بات ہے میرے ابا جان نے ایک ہی وقت میں اسّی بندے مار دیئے تھے بعد میں پتا چلا کہ اس کا ابّا نیو خان کا ڈرائیور تھا۔خبروں میں دہشت گردی کی خبریں بھی پیش کی جاتی ہیں اور دہشت گردوں سے بچاؤ کے طریقے بھی بتائے جاتے ہیں کیونکہ

ملک کے بعض شہروں میں دہشت گردی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہاں اگر شادی ہو تو بارات جاتی جہاز پر ہے اور آتی اخبار پر ہے۔ ٹی وی والے بڑے چالاک ہیں وہ پڑھنے والوں کو ایسی ہدایات دیتے ہیں کہ اگر پانچ افراد دہشت گردی سے مرے ہیں تو خبر اس خاص انداز سے پیش کریں کہ دس دیکھنے والے مر جائیں۔ اس طرح عوام کا دھیان خبر کی طرف کم ہی جاتا ہے پھر وہ خبریں سنتے نہیں بلکہ صرف دیکھتے ہیں۔ پاکستانی ٹی وی کے بارے میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ڈرامے میں اشتہارات اور خبروں میں ''ڈراما'' پیش کرتے ہیں۔

خبروں کا ایک اور ذریعہ اخبارات بھی ہیں لیکن اخبارات میں بھی جو خبریں دی جاتی ہیں وہ بھی کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں خبر کم اور مزے زیادہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ خبریں دیکھیے: بازارِ حسن میں آگ لگ گئی عملے نے دو گھنٹے کی مسلسل جدوجہد سے آگ پر تو قابو پالیا لیکن اب عملے پر قابو نہیں پایا جا رہا۔ فیصل آباد میں کپڑے کی مل کا مالک ایک مقامی ہوٹل کے کمرے میں بغیر کپڑوں کے پایا گیا۔

اس کے علاوہ خبروں میں یہ دِکھاتے ہیں کہ فلاں وزیر نے فلاں بائی پاس کا افتتاح کیا حالانکہ اس وزیر کا اپنا پہلے ''بائی پاس'' ڈاکٹر کر چکے ہوتے ہیں۔ مہنگائی کے حوالے سے ایک وزیر ٹی وی پر فرما رہے تھے کہ یہاں کے لوگ خواہ مخواہ مہنگائی کا واویلا مچاتے رہتے ہیں حالانکہ اگر آپ بازار میں دس ڈالر لے کر جائیں تو وہ جلدی ختم نہیں ہوتے۔ یاد رہے ہمارے ملک کے عموماً حکمرانوں کی صرف جان اس ملک میں ہوتی ہے یا پھر بریف کیس اور اوپر سے ہمارے لوگ بھی امپورٹڈ چیزوں کو کچھ زیادہ ہی

پسند کرتے ہیں۔

موسم کی خبروں میں زیادہ تر ہوائی خبریں ہی ہوتی ہیں۔ اس میں زیادہ سے زیادہ یہ بتایا جاتا ہے کہ آج سورج مشرق سے ہی طلوع ہوا اور مغرب میں ہی غروب ہو گیا۔ سورج کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور ہماری حرکتیں دیکھ کر وہ مغرب میں جا چھپتا ہے۔ (یاد رہے بڑے سے بڑا لیٹرا بھی ہمیشہ ''مغرب'' میں ہی جا کر چھپتا ہے) لیکن چاند کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا کہ اب ''نیا چاند'' کب ''چڑھے'' گا۔

موسم کی خبریں پڑھنے والوں کا انداز بھی مشرقانہ و مغربانہ ہے وہ کچھ اس طرح سے کہ جب وہ بتاتے ہیں ''مون سون ہوائیں'' اس مہینے پاکستان میں داخل ہو رہی ہیں لہٰذا جو لوگ ہنی مون منانا چاہتے ہیں وہ سون سون ہنی مون منالیں۔ اس طرح کچھ لوگ ہنی مون مناتے رہتے ہیں اور کچھ کنوارے بے چارے شادی کروانے کے لیے والدین کو مناتے رہتے ہیں۔

کھیلوں کی خبروں میں زیادہ تر مردوں کی دوڑ دِکھاتے ہیں اور کبھی کبھی عورتوں کی دوڑ بھی دِکھاتے ہیں حالانکہ عورتوں کا ''بھاگنا'' کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔

تجارتی خبروں کا تو ذِکر ہی کیا وہ تو ہمیشہ سٹاک مارکیٹ میں ''مار'' کا رجحان رہتا ہے اور منڈی میں مندی ہی رہتی ہے۔ خبروں کے فوراً بعد قائداعظم کا فرمان دِکھایا جاتا ہے کہ ''کام، کام اور صرف کام'' لیکن اس قوم نے قائداعظم کے فرمان کو بھی نہیں بخشا۔ اس کے کام کا بھی کام تمام کر دیا ہے جیسے A کام B کام اور C کام وغیرہ۔

ٹی وی پر اُردو اور انگریزی زبان کا ملک شیک کیا جاتا ہے لیکن زیادتی اُردو کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اُردو زبان تو ویسے بھی بے چاری بے زبان معلوم ہوتی ہے۔

ایک صاحب ٹی وی پر فرما رہے تھے کہ میں پچھلے دِنوں سک (Sick) ہو گیا تھا تو ایک بزرگ پوچھنے لگے کہ بیٹا کیا یہ کم بخت ''سکھ'' ہو گیا تھا۔ اسی طرح ایک ماہرِ نفسیات ''نفسیات'' کے بارے میں بتا رہا تھا تو وہ بار بار ''سائیکالوجی'' کا لفظ استعمال کر رہا تھا تو ایک لکھے پڑھے صاحب نے پڑھے لکھے صاحب سے پوچھا کہ یہ کیوں بار بار کہہ رہا ہے کہ ''سائیکل لوجی۔''

بعض لوگ انگریزی اور اُردو کا بڑا حسین امتزاج پیش کرتے ہیں، جیسے ایک کمپیئر نے اداکارہ ''خوشبو'' کو بلانا تھا تو اس نے کچھ اس طرح سے مخاطب کیا کہ ناظرین اب میں دعوت دیتی ہوں اداکارہ (Smell) سمیل کو کہ وہ تشریف لائیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بالکل انگریزی نہیں جانتے اور ساری عمر تکے سے ہی جواب دیتے رہتے ہیں جیسا کہ وہ تکے سے ٹی وی پر آئے ہوتے ہیں۔

ہمارے ملک کی ایک گلوکارہ انگلینڈ گئی وہاں انگریزوں نے اس کے بچے کی انشورنس کرنا چاہی تو انھوں نے اس کی تاریک پیدائش معاف کیجئے گا تاریخِ پیدائش پوچھی تو اس نے وہاں بھی تکے سے ہی جواب دیا کہ تاریخ پیدائش کا تو مجھے کوئی پتا نہیں البتہ اس وقت ابھی خربوزے نئے نئے آئے تھے اور پھر دوسرے بچے کے بارے میں بھی اس نے یہی جواب دیا تو یوں ثابت یہ ہوا کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر ہی رنگ پکڑتا ہے۔

ہماری اداکارائیں اور اداکاروں کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے کیونکہ وہ بولتے انگریزی ہیں اور کام کچھ اس طرح کی فلموں میں کرتے ہیں جیسے ماجھو، نظام لوہار، گجر داویر، خرد ماغ گجر، ماکھا جٹ؛ جی او جٹا، بالی جٹی، نوراں، کاکے دا کھڑاکک غنڈی رن اور رانو پھڈے باز وغیرہ۔

ہمارے ایک دوست جن کی آدھی عمر اس خواہش میں گزر گئی کہ وہ بھی میٹرک میں انگریزی پاس کر سکیں لیکن انگریزی نے ان کے ساتھ وفا نہ کی اور اب وہ احتجاجاً پنجابی فلموں کے تراجم انگریزی میں کر رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک انگریزوں سے بدلہ لینے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایک پنجابی فلم ''نظام لوہار'' کا ترجمہ ''System, the Black Smith'' کے نام سے کیا ہے اور اب ''سلطانہ ڈاکو'' کا ترجمہ ''"Kinga" the Robber'' کے نام سے کر رہے ہیں۔

پاکستانی فلموں کے بارے میں تو یہی رائے دی جا سکتی ہے کہ اگر کسی کو سخت سے سخت سزا دینی ہو تو اسے لگاتار دس پاکستانی فلمیں دِکھائی جائیں۔ ہمارے عام عوام کی طرح اداکار اور اداکارائیں بھی کافی غریب ہیں اور بعض اوقات اس کا اظہار اپنے گانوں میں بھی کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ایک گانے میں ''ریما'' نے ''ریشم'' سے لہنگا ادھار لیا تو اس کا ذِکر کچھ یوں کرتی ہے۔ ''ریشم'' کا لہنگا میرا۔

کچھ گانوں سے ملکی معیشت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے، جیسے ''بہ جا سائیکل تے'' کیونکہ عاشقان حضرات کے پاس کار تو ہے نہیں بلکہ وہ بے کار ہیں اور

اگر کسی کے پاس ہے بھی تو پٹرول کی بڑھتی ہوئی قیمت دیکھ کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ''بہ جا سائیکل تے'' اس سے پہلے گانوں میں زیادہ تر دِل کا رونا رویا جاتا تھا اور اب ہماری قوم کو ''دِل'' سے زیادہ ''دال'' کی فکر ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ جس طبقے کو دال کی فکر نہیں ہے اس کو ہر وقت دِل کی فکر رہتی ہے۔

اس کے علاوہ یکم اگست سے چودہ اگست تک ملّی نغمے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ جس میں وطن سے محبت کا اظہار ہوتا ہے اور اچھے وقت کی اُمید، اگرچہ اس ملک میں اچھا وقت بھی ایسے ہی آ رہا ہے جیسے اسلامی نظام۔ اس ملک میں سارے بل فوراً پاس ہو جاتے ہیں سوائے شریعت بل کے۔ اگر ٹی وی پر اچانک مسلسل ملّی نغمے دکھائے جائیں تو سمجھ لیں! پھر اسمبلیاں ٹوٹ گئیں۔

کچھ اداکاراؤں کو دیکھ کر لوگ بے اختیار ہو جاتے ہیں جیسے ''زیبا بے اختیار'' وغیرہ۔ کیونکہ ان کے اختیار میں صرف بے اختیار ہونا ہی ہے۔

ٹی وی پر اگر نئی نسل کے لوگ پرانے گانے سنیں یا پرانی فلمیں دیکھیں تو نئی نسل میں سے ان کے بعض دوست ناراض ہو جاتے ہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آج سے چالیس سال پہلے ہمارے بزرگ بھی انھی گانوں اور فلموں پر آہیں بھرتے رہے ہوں گے اور ہم بھی۔۔۔ آخر غیرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

ٹی وی کے کچھ گانے دوستوں کو ناراض کرنے کا بھی سبب بنتے ہیں۔ میرے ایک دوست ''شاہ صاحب'' فقط اس لیے مجھ سے ناراض ہو گئے کیونکہ میں یہ گانا سن رہا تھا۔ ''کالا شاہ کالا'' تو اس طرح وہ مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رُوٹھ کر ''کالا شاہ کا کو''

چلے گئے۔

اس کے علاوہ ٹی وی پر عجیب و امیر قسم کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جیسے خصوصاً صبح صبح ٹی وی کھولیں تو اکثر فائن آرٹ والے رنگ لے کر رنگ بازی کرتے نظر آتے ہیں۔

کچھ پروگرام خواتین کو خوب صورت بنانے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ (''خوبصورت'' سے خواتین کو سمجھ جانا چاہیے کہ وہ۔۔۔'') ایک بیوٹیشن بتا رہی تھی کہ خواتین کو رات کو بھی میک اَپ کر کے سونا چاہیے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے خواب میں آ جائیں۔ ان لوگوں نے تو عورت کی عقل کی جگہ کا بھی خاتمہ کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت کی عقل اس کی ''گُت'' میں ہوتی ہے تو لہٰذا۔۔۔

ہمارے ٹی وی پر کھانے کے پروگرام بہت زیادہ پیش کیے جاتے ہیں اور عام آدمی کی زبان پر ان کھانوں کے نام سے ہی کھلیاں پڑ جاتی ہیں اور ساتھ خواتین کو یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کھانا پکاتے وقت ہاتھوں پر دستانے چڑھا لیں تاکہ ''سوزش'' نہ ہو جائے حالانکہ سوزش سے زیادہ مجھے یہ ''سازش'' معلوم ہوتی ہے۔

ٹی وی پر سائنسی پروگرام بھی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے تحت پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میں اکثر یہ بتایا جاتا ہے کہ ناظرین سوئی میں دھاگہ آسانی سے کیسے ڈالا جا سکتا ہے؟

آخر میں یہ اِلتجا ہے کہ ٹی وی کے ہدایت کاروں کو چاہیے کہ ایسے پروگرام پیش کریں جو قوم کو بے کار نہ بنائیں بلکہ ہدایت کی راہ پر گامزن کریں۔ ہم تو صرف دُعا

ہی کر سکتے ہیں کہ اللہ ان ٹی وی کے ہدایت کاروں کو ہدایت دے۔ ٹی وی کا آخری پروگرام ''دُعا'' ہوتا ہے جس میں گناہ بخشوائے جاتے ہیں اور پھر کیے جاتے ہیں۔ آخر میں اناؤنسر یہ بھی کہتی ہے کہ ناظرین ہمارا ''اللہ حافظ''

ہم سب اس بات سے تو سو فی صد اتفاق کرتے ہیں کہ واقعی ہمارا اور ہمارے ٹی وی کا اللہ ہی حافظ!

○○○

پینڈو پروڈکشن

ایک دفعہ کسی گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا آدمی گیا۔ وہاں اس نے ایک بزرگ سے پوچھا۔ بابا جی یہاں کوئی بڑا آدمی نہیں پیدا ہوا؟ انھوں نے بھول پن سے جواب دیا ''نہیں بیٹا یہاں بچے چھوٹے چھوٹے ہی پیدا ہوتے ہیں۔''

اب نہ ایسے بزرگ رہے نہ ایسے گاؤں۔ اب تو نوجوان چاہے قصبہ کے ہوں یا گاؤں کے پڑھ لکھ رہے ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے شہروں کا رُخ کرنے لگے ہیں۔

مگر وہاں اداروں میں ان کے لیے ''مسئلہ فیثا غورث'' جیسا ایک مسئلہ منتظر ہوتا ہے یعنی شہری لڑکیاں انھیں ''پینڈو'' کہہ کر چھیڑتی ہیں۔ دیکھا جائے تو اس میں کوئی بری بات نہیں خاندانی لوگ تو پینڈو ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں، مگر ایسے ویسے ''پینڈو'' کے نام کو سنتے ہی زکام لگی مینڈگی کی طرح بدک جاتے ہیں۔ شہری کہلانے

کے چکر میں وہ کہیں کے نہیں رہتے اور اس طرح نہ وہ میل رہتے ہیں نہ فی میل بلکہ ای میل بن جاتے ہیں جو ایک وقت میں لاہور اور دوسرے میں ''سمے سٹھے'' اور بُرا وقت پتہ نہیں ''کتھے سٹے''

ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ بھی مرونڈا کھانے کے بجائے مرنڈا پئیں۔ اداروں میں جو لڑکیاں ان کو ''پینڈو'' کہتی ہیں انھیں بھی وہ ''دوستی پان مصالحہ'' دے کر دوست بنا لیتے ہیں اور پھر بناتے ہی چلے جاتے ہیں۔

بعض لڑکیاں فقرے کستی ہیں کہ یہ شہر میں بتیاں دیکھنے آتے ہیں مگر ان کی یہ بات شاید درست ہے کہ شہر میں بتیاں زیادہ ہیں لیکن روشنی کم ہے اور پنڈ میں بتیاں کم ہیں لیکن اُجالا زیادہ ہے۔ یہ پینڈو بھی کم زیرک نہیں ایسا چکر چلاتے ہیں کہ پھر ایک دن وہی لڑکیاں ان پینڈوؤں کے ہجر میں ''بتیاں بجھائی رکھدی تے دِیوا بلے ساری رات''۔ گاتی رہتی ہیں۔

یہی پینڈو ان لڑکیوں کو گاؤں کے بارے میں ایسے سبز باغ دِکھاتے ہیں جیسے قوم کو ہمارے سیاسی رہنما اور پھر جب یہ کسی نہ کسی بلکہ اُسی طرح پنڈ پہنچ جاتی ہیں تو یہ واقعی پنڈ کے ہرے بھرے اور سبز باغوں میں کھو جاتی ہیں۔ اس حادثے کے بعد چند ہی برسوں میں محکمہ بہبودِ آبادی کا سائن بورڈ بے معنی سا لگنے لگتا ہے۔

اور زبان کے حوالے سے ان کی اُردو بھی گلابی ہو جاتی ہے اور اکثر ایسے فقرے بولتی سنائی دیتی ہیں۔ ''بیٹا ذرا دیکھنا کٹاج کو چونگ رہا ہے۔'' اور ''ٹوتھ برش کا استعمال ایسے کرو کہ آپ کے دانت چیٹے چیٹے لگنے لگیں۔'' یا ''بیٹا ذرا دیکھنا کیا یہ

چھت چوتی ہے؟'' اگر بیٹا نہ مانے تو غصے میں آ کر پھر کہتی ہیں کہ ''تم ہمارے جڈے ہو گئے ہو اب تو کچھ اپنے وڈیوں کا حیا کرو۔'' اور بعض اوقات جب یہ جانوروں کے باڑے کے قریب سے گزرتی ہیں اور ''کھوتا'' ان کو دیکھ کر ہنہنا تا ہے تو یہ اُسے بڑی اَدا سے کہتی ہیں کہ! ''دیکھو گدھے مت بنو۔''

شروع شروع میں یہ بجلی کی طرح میکے جاتی ہیں مگر جلد ہی بجلی کے بل کی طرح آدھمکتی ہیں بعد میں تو کسی مرگ یا شادی پر ہی جانا ممکن ہو پاتا ہے اور اس موقع پر ان کی کیفیت شادیٔ مرگ جیسی ہوتی ہے۔

مہمانوں کے حوالے سے ان میں کچھ یوں تبدیلی آتی ہے کہ بھاگ بھاگ کر کولڈ ڈرنکس پیش کرنے کے بجائے اب ''لسّی'' سے ہی سب کو ٹھنڈا کرتی ہیں۔

کسی دَور میں والدین سے طرح طرح کے لینز منگوانے کے لیے پیسے مانگتیں تو وہ کچھ اپنی جمع پونجی سے اور کچھ پاکستان کی طرح قرض لے کر ان کی خواہش پوری کرتے اور خود قرض خواہوں کی ایسی شرائط کا شکار ہو جاتے جو ''IMF'' کا طرۂ امتیاز ہے۔ اب حالت یہ ہو چکی ہوتی ہے کہ میک اَپ کے سہارے جینے والی بسوں میں بکنے والا ''ہاشمی سرمہ'' استعمال کرنے لگتی ہیں اور آنکھ لگنے سے آنکھ لڑنے تک کی جملہ بیماریوں کا علاج اسی سے کرتی ہیں۔

مہمان جو رحمت ہوتے ہیں اب ان کو زحمت لگنے لگتے ہیں یعنی کھانا پکانا تو ایک طرف چار مہمان آ جائیں تو یہ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ پھر جب کبھی یہ اپنے والدین سے گاؤں کے متعلق بات کرتی ہیں تو وہ انھیں یہ بتا کر تسلی دیتے ہیں کہ ان کے

آباؤ اجداد بھی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ان کو یہ سن کر کچھ تسلی ہوتی ہے کہ اس میدانِ عشق میں وہ اکیلی نہیں ہیں۔ گویا وہ دائرہ مکمل کر کے پھر صفر سے شروع ہوتی ہیں۔ پھر جب کبھی ان کے بچے بڑے ہو کر کسی شہر میں پڑھنے جاتے ہیں تو لڑکیاں انھیں ''پینڈو'' کہہ کر چھیڑتی ہیں تو ماں کی نصیحتوں کی وجہ سے وہ بُرا نہیں محسوس کرتے بلکہ دِل ہی دِل میں کسی لڑکی کو ''پنڈ'' لے جانے کا سوچتے ہیں جو دائرے کا سفر صفر سے شروع کرے اور انھیں خوب خبر ہوتی ہے کہ ان کو ان کے کہے کی سزا ضرور ملے گی بے شک ''کوٹھے پنڈ'' ہی کیوں نہ ملے۔ اس طرح دائرے کے اس سفر سے ''پینڈو پروڈکشن'' میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے اسی لیے تو ''پینڈو پروڈکشن'' کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے۔

ع پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

○○○

کنوارے بے روزگار

آج کے دور میں نوکری کا ملنا بھی ایسے ہی ہے جیسے کسی کھرے انسان کا ملنا۔ نوجوان نوکری کے پیچھے اس طرح ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں جیسے اُسامہ بن لادن کے پیچھے امریکہ، پھر اس چکر میں یہ نوجوان بالآخر جوان ہو جاتے ہیں۔

کنوارے بے روزگار بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں مثلاً ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور اگر ان کی یہ کوشش پوری ہو جائے یعنی کسی ادارے میں نوکری مل بھی جائے تو ان کو محض پندرہ سو یا دو ہزار روپے بطور خیرات دیتے ہیں اور بدقسمتی سے اکثر اِن کا ادارہ تیسری یا چوتھی منزل پر واقع ہوتا ہے۔ یوں روز روز اپنی منزل پر چڑھنے سے ان کے ''گوڈوں'' کا روغن کم ہونا شروع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات چلتے ہوئے ان کے گوڈوں سے ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے گاڑی کے بیرنگ سے گریس نہ دینے کے سبب۔

کچھ نوجوان ایسے بھی ہوتے ہیں جو ''ڈگ ڈگ'' کے ڈگری لے لیتے ہیں اور پھر کسی اچھی نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان بے چاروں کے پاس جو تھوڑی بہت رقم ہوتی ہے وہ فوٹو سٹیٹ والے ہتھیا لیتے ہیں۔ آخر کار ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب ان کا جی چاہتا ہے کہ کاش نوٹ کی بھی فوٹو سٹیٹ چل سکیں۔

شروع میں تو فارموں پر لگانے کے لیے تصویریں بڑے شوق سے بنواتے ہیں لیکن پھر ان کی یہ صورتِ حال ہو جاتی ہے کہ

ع جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

کچھ سمجھ دار قسم کے لوگ تو تصویر کا رُخ دیکھ کر ہی یہ بتا دیتے ہیں کہ یہ پہلے کتنی دفعہ خجل ہو چکا ہے۔ ان کی تصویریں تقریباً ہر دفتر میں موجود ہوتی ہیں اور جہاں کہیں بھی کوئی آسامی نکلتی ہے یہ فوراً ایسے جا پہنچتے ہیں جیسے گڑ پر مکھیاں۔

یہ روزانہ اخبار دیکھتے ہیں اور خصوصاً جہاں خالی آسامیاں کے اشتہارات آتے ہیں۔ پھر اپنے عمری تقاضے کی وجہ سے ان کو کچھ اور عادتیں بھی پڑنا شروع ہو جاتی ہیں جو کافی حد تک فطری ہوتی ہیں۔ یہ نوکری کا اشتہار دیکھتے دیکھتے فلموں کے اشتہارات تک بھی جا پہنچتے ہیں اور اس طرح اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نوکری کا نہ ملنا بھی عذاب سے کم نہیں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ نہ نوکری ملے اور نہ ''چھوکری''۔ بعض اُکتائے ہوئے نوجوان تو شادی کروانے کے لیے بہت چھوٹی موٹی نوکری کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور یوں وہ بھی اپنا نام شہیدوں میں لکھوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ کچھ بے چارے غم کے مارے کبھی

کبھار اگر اپنے والدین سے کہیں کہ اب مجھے بھی بیگم لا دیں تو وہ کہتے ہیں کہ بیٹا پہلے ''بے غم'' تو ہو جاؤ پھر بیگم بھی لا دیں گے۔ یوں وہ بھی جلتی پر مزید تیل ڈالتے ہیں۔

بعض اپنے ارادے کے بہت پکے ہوتے ہیں جو نوکری کے اشتہارات بھی پڑھتے ہیں اور چوری چوری ضرورت رشتہ کے بھی۔ اب نوکری ان کی ضرورت نہیں بلکہ ضد بن چکی ہوتی ہے۔

ان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ کسی سے نہیں لڑتے سوائے اپنے مقدر کے۔ پھر بھی اگر کسی سے لڑ پڑیں تو اپنے بے روزگار استاد کے اس قول کو نظر انداز نہیں کرتے کہ پہلے فوراً حریف کی ٹانگوں کو پکڑو اور اگر حریف زیادہ طاقتور ہو تو اس کے پیر پکڑو۔

مختلف جگہوں پر اکثر انٹرویو دینے والوں میں کوئی نہ کوئی لڑکی بھی شامل ہوتی ہے۔ یہ ان کے لیے مزید دُکھتی رگ ثابت ہوتی ہے۔ ان سب میں بہت زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ سبھی ایک دوسرے کو نوکری کے بارے میں آگاہ کرتے رہتے ہیں اور کچھ دُور اندیش تو مل کر ایک اچھا سا تھری پیس سوٹ بھی خرید لیتے ہیں اور پھر تمام لوگ باری باری وہی سوٹ پہن کر انٹرویو دیتے ہیں اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جو یہ سلوک اس سوٹ کے ساتھ کرتے ہیں وہی سلوک ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ نوکری حاصل کرنے کے لیے بعض جگہوں پر امتحان ہوتا ہے اور اس طرح یہ بے چارے ایک اور امتحان سے گزرتے ہیں۔

ایک جگہ نوکری کے لیے ٹیسٹ ہو رہا تھا تو ایک صاحب جن کا آخری موقع

تھا وہ پرچہ حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی اور ان سے کوئی جواب پوچھتی۔ دو دفعہ اس نے ایسا کیا جب تیسری دفعہ اس نے پین مار کر پوچھا کہ کتاب ''خمارِ گندم'' کس نے لکھی تھی تو ان صاحب نے غصے میں آ کر ایک گالی سے نامعلوم مصنف کو نوازتے ہوئے کہا کہ۔۔۔ معلوم نہیں کس کم بخت نے لکھی تھی۔ جب یہ پہلی دفعہ ٹیسٹ دیتے ہیں تو انھیں الگ بٹھایا جاتا ہے اور خواتین کو الگ لیکن ایک دو دفعہ کے بعد پھر انھیں اکٹھا ہی بٹھا دیا جاتا ہے کیونکہ حکومت یا ادارہ انھیں ضرر رساں نہیں سمجھتا۔ پھر خواتین اور مردوں میں کوئی فرق نہیں روا رکھا جاتا کیونکہ وہ اس مقام پر آ پہنچتے ہیں کہ:

ع نہ کوئی ''بندہ'' رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

راہ چلنے والی ہر لڑکی کو یہ آنکھ بھر کر دیکھتے ہیں اور اسے اپنا مستقبل سمجھتے ہیں۔ یہ دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ اگر نوکری ملی تو ایسی ہی لڑکی سے شادی کریں گے۔ ان میں سے کچھ کو عمر کے آخری حصے میں نوکری مل ہی جاتی ہے اور شادی بھی ہو جاتی ہے لیکن ان کی یہ خوشی بہادر شاہ ظفر کی حکومت جیسی ثابت ہوتی ہے۔ پہلے پہل تو انھیں یہ کچھ سمجھ نہیں آتی کہ شادی کسے کہتے ہیں؟ وہ شادی کے مفہوم اور رموز و علائم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ وہ اسے بھی کوئی بہت مشکل سوال تصور کرتے ہیں اور اس کا جواب بھی کسی گائیڈ یا کتاب سے نقل کر کے بتانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ سوال ہی ان کے لیے دراصل ''جواب'' ثابت ہوتا ہے اور پھر یہ کچھ اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

ع اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

اس بڑھاپے میں ان کی جمع پونجی شربت فولاد یا چند ادویات کے سوا کچھ نہیں ہوتی اور شاید اسی بڑھاپے کے باعث ان کے بچے انھیں ''ابا جان'' کہنے کے بجائے ''بابا جانی'' کہتے ہیں۔ ان سے جب کوئی پرانا بابا پوچھتا ہے کہ بیٹا آپ کتنا پڑھے ہیں؟ تو یہ سولہ (ایم۔اے) کہنے کے بجائے ان سے درخواست کرتے ہیں کہ ''بابا جی سو۔لا'' اس طرح ان کی زندگی ''سولہ'' اور ''سو۔لا'' کے درمیان اٹک کر رہ جاتی ہے۔

حکومت کو چاہیے کہ تمام ماسٹرز ختم کر کے ''بیروزگاری'' میں ماسٹرز کروائے تاکہ بعد میں ان بے چاروں کو بے روزگاری کا سامنا کرتے ہوئے پریشانی نہ ہو۔ یہ تو خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہاں ابھی شرح خواندگی بہت کم ہے ورنہ۔۔۔ یہ بے روزگار اتنے متقی ہیں کہ انھیں ولی اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ ایک ماہ کے روزے رکھنا ان کے لیے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سب بیروزگار اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے دُعا کر کے دوبارہ چھ ماہ کے روزے کروانے چاہئیں۔ یہ خوب جانتے ہیں کہ ویسے بھوکوں مرنے کا کیا فائدہ! اس کا انھیں ثواب ملنا چاہیے۔

ان میں سے اکثر بے چارے نشہ یا ڈکیتی وغیرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور آخر کار پولیس سے اختلاف کے باعث جب کبھی پکڑے جاتے ہیں تو وہی لوگ جنھوں نے ان کو اس مقام پر پہنچایا ہوتا ہے وہی ان کو سولی پر چڑھانے کا حکم صادر فرماتے ہیں اور اپنی دانست میں معاشرے سے برائی ختم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

○○○

لوکل بس سے کالج تک

ہم جس کمرے میں اُردو پڑھا کرتے تھے وہ بازار کے بالکل ساتھ تھا۔ اس میں باہر سے آنے والی ہر آواز کانوں کان سنی جا سکتی تھی اور یوں اُستاد صاحب کی آواز کم سنائی دیتی اور باہر کی زیادہ۔ لیکچر کی کوئی سمجھ نہیں آتی تھی البتہ پھلوں اور سبزیوں کی قیمت کا اندازہ بخوبی ہو جاتا تھا۔ اُستاد صاحب بھی سبزی فروشوں اور پھل فروشوں کو اِس لیے کچھ نہیں کہتے تھے کیونکہ وہ بھی اُن کے ہی شاگرد ہوتے تھے۔

کلاس روم میں کچھ لڑکے بلیک بورڈ پر عجیب و غریب قسم کا شوق فرماتے مثال کے طور پر ''نی ماسی تیری دِھی دانخرہ بڑا'' کے گانے کا بول وہ لڑکے لکھتے جن کا جھگڑا تو اپنی ماسی کے ساتھ ہوتا مگر وہ ''مگر مچھ'' بدنام اس کی ''دِھی'' کو کرتے تھے شاید وہ کلاس روم کو بھی اپنی ماسی کے گھر کا ڈرائنگ روم سمجھتے تھے۔

کچھ لڑکے فلموں پر تبصرہ کرتے۔ ایک دِن دو سٹوڈنٹ ایک فلم پر تبصرہ کر

رہے تھے ایک کہہ رہا تھا۔ یار کل ہم نے جو فلم دیکھی تھی اس کی سٹوری ہی سٹوری تھی کہانی تو دو نمبر ہی تھی۔ دوسرے نے بڑے تعجب سے جواب دیا ہاں یاد آیا! یار کل ہم نے کونسی فلم دیکھی تھی؟

اکثر اوقات میں بیچارہ لوکل ٹرانسپورٹ کا مارا ہمیشہ کالج دیر سے ہی پہنچتا۔ کبھی حاضری سے بھی رہ جاتا۔ ٹرانسپورٹ کا مارا یوں کہ ہمارے روڈ پر جو بسیں چلتی ہیں وہ لوکل ہیں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لوکل بس کسے کہتے ہیں؟

لوکل بس کا ایک سیدھا سادا سا مطلب تو یہ ہے کہ جب بس رستے میں خراب ہوتی ہے تو سواروں کے منہ سے اچانک نکلتا ہے کہ ''لو۔کل''

اس کے علاوہ ہمارا آدھا ''ادب'' تو بسوں کے پیچھے لکھا ہوتا ہے یوں اس سے بھی بس کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے جیسے جب بس کمپنی سے نکلتی ہے تو مالک اس کے پیچھے غرور سے لکھوا دیتا ہے۔ ''دیکھو تو رچکوری دی'' جب کہ ''ماں کی دُعا جنت کی ہوا'' آگے لکھوا دیتا ہے۔ ''روٹ ہمراہ ہے'' اور بس کی پچھلی طرف نمبر پلیٹ کے بالکل نیچے ''جلنے والے کا منہ کالا'' لکھواتا ہے، پھر مالک اسے کسی جی۔ٹی روڈ پر چلا دیتا ہے اور جب چلتے ہوئے اسے ہماری حکومت کی طرح چھ ماہ گزر جاتے ہیں تو ڈرائیور بس کا کسی درخت کے ساتھ بامصافحہ تعارف کرواتا ہے۔ پھر بس اور درخت آپس میں گلے ملتے ہیں اور بس کا کافی حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ بس کا مالک اس کی کچھ مرمت وغیرہ کروا کر پھر بس کے پیچھے لکھوا دیتا ہے کہ ''کھیڈ مقدراں دی'' اور اس کے اُوپر لکھوا دیتا ہے ''تو لنگ جا ساڈی خیر اے۔''

کچھ ہی عرصہ بعد اس کا کسی ٹرک کے ساتھ ملاپ ہوتا ہے پھر شیشے ٹوٹ جاتے ہیں۔ سیٹیں سجدے میں جھک جاتی ہیں، ٹائر پھٹ جاتے ہیں، انجن لٹک جاتا ہے گویا بس کا نقشہ ہماری قوم کی طرح استحصالی سا نظر آنے لگتا ہے۔

اس کے علاوہ بس کی بتیاں گواچ جاتی ہیں اور پھر مالک یہ گانا گاتا ہے کہ ''بتیاں بجھائی رکھدی تے دیوا بلے ساری رات'' اب مالک کا بھی کنگال بنک سے پورا رابطہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اگرچہ بعد میں اسے بلڈ بنک والوں سے بھی خود رابطہ کرنا پڑتا ہے۔

پھر وہ اسے کسی مکینک کی دُکان پر لے جاتا ہے۔ سیٹوں کو رسوں سے بندھواتا ہے۔ بس کے پچھلے بڑے شیشے کی جگہ وہ پرانا سا بڑا کپڑا لے کر باندھ دیتا ہے تاکہ پیچھے سے ہنستے ہوئے لوگ نظر نہ آئیں اور سائیڈوں کے شیشے بھی نہیں لگواتا کیونکہ اس میں اُسے اپنا بھی اصلی چہرہ نظر آتا ہے۔ بس کی بتیوں کی جگہ ایک لالٹین خرید کر اس میں تیل ڈلواتا ہے اور اپنے دل سمیت جلا کر اسے اگلے پہیوں کے دھرے کے ساتھ باندھ دیتا ہے اور پھر بس کے پیچھے لکھوا دیتا ہے ''سکھ نال نصیباں دے'' اگرچہ آج کل کچھ ''نصیبو'' کے پرستار تو یہ لکھواتے ہیں کہ ''سکھ نال نصیبو دے'' کیونکہ ان کے نصیبوں میں صرف ''نصیبو'' ہی ہے ''پاک فوج کو سلام'' اور پھر اسے کسی لوکل سڑک پر چلا دیتا ہے۔

اس پر ایک اسّی (۸۰) سالہ ڈرائیور بٹھا دیتا ہے جس نے نظر کی بیماری کے علاوہ (اگرچہ عموماً ڈرائیور حضرات کی ''نظر خراب'' ہی ہوتی ہے) عینک اس لیے بھی لگا رکھی

ہوتی ہے تاکہ آنکھوں میں مچھر یا مٹی نہ پڑے کیونکہ اگلا شیشہ تو ہوتا ہی نہیں۔ بس کا مالک پھر بس میں نئے سال کی جنتریاں بھی بیچتا ہے اور کرایہ بھی خود ہی وصول کرتا ہے۔

جب بس چلتی ہے تو آس پاس کے لوگوں کو اپنی چھٹی حس سے پتا چل جاتا ہے کہ بس آ رہی ہے۔ ڈرائیور جب بس چلا رہا ہوتا ہے تو اسے اس کے علاوہ بھی کئی کام کرنا پڑتے ہیں چونکہ بس کا ہارن نہیں ہوتا اس لیے وہ ایک ہاتھ سٹیرنگ پر رکھتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے اشارہ کر کے سامنے والی چیز کو ایک طرف کرواتا ہے۔ یاد رہے ان بسوں کا ''چلن'' کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔

جس بس میں یہ خوبیاں پائی جائیں وہ ''لوکل'' بس کہلاتی ہے جو تقریباً ہر جگہ برائی کی طرح دندناتی پھرتی ہیں۔ یہ چیختی اور ڈگمگاتی ہوئی مسافروں کو ان کی منزلِ مقصود تک دھکیلتی ہیں اگرچہ مسافران بسوں میں سوار ہو کر منزل کو مفقود ہی سمجھتے ہیں۔ ان بسوں کا ایک فائدہ ہے کہ یہ سب قدرتی ایئر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں اگرچہ سردیوں میں اس کا مسافروں کو نقصان بھی پہنچتا ہے کیونکہ ڈرائیور اسے بند نہیں کر سکتا اگرچہ رفتار مزید آہستہ کر کے اسے کم تو کر سکتا ہے۔

ان بسوں کے اندر کھڑکی کے عین سامنے یہ فقرہ لکھا ہوتا ہے کہ ''شاید اس بس میں آپ کا یہ آخری سفر ہو'' یوں یہ بسیں انسان سے بھی زیادہ بے بس ہیں۔

میں نے بدقسمتی سے پہلی دفعہ جب لوکل بس پر سفر کیا تو مجھے بس پر سوار ہوتے ہی اس کی حالت پر ترس آیا کیونکہ اس کی کھڑکی کے سامنے یہ شعر لکھا ہوا تھا:

کمالِ ڈرائیور نہ انجن کی خوبی
خدا کے سہارے چلی جا رہی ہے

لوکل بس جب دُور سے آتی ہے تو کوئی پہچان نہیں سکتا کہ کیا آ رہا ہے مگر اس بس پر سفر کرنے کے بعد مسافر کو کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ کون آ رہا ہے۔ بس کو دیکھ کر بس کے منتظر مسافروں کو اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی بے روزگار کو روزگار ملنے سے۔ لوگ بس کی سائیڈوں پر کچھ اس طرح چمٹے ہوتے ہیں جیسے ہمارے سیاستدان قومی خزانے سے۔

یوں لوکل بسوں میں رش کا تو یہ عالم ہوتا ہے کہ خارش اپنی ٹانگ پر ہوتی ہے اور کھجائی ساتھ والے کی جاتی ہے۔ اس طرح وہاں اپنی پرائی ٹانگ کا کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں خواتین سے لڑائی کا خدشہ بھی رہتا ہے کیونکہ مردوں اور عورتوں کی سرحدیں اس طرح ساتھ ساتھ واقع ہوتی ہیں جیسے پاکستان اور ہندوستان کی بلکہ اس مقام پر یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ پاکستان میں مرد اور عورت شانہ بشانہ سفر کر رہے ہیں۔ یاد رہے غریب لوگوں کی اس مجبوری کو روشن خیالی یا اعتدال پسندی ہرگز تصور نہ کیجیے گا۔

ان بسوں پر ویسے تو ہم روزانہ سفر کرتے تھے مگر ایک دِن یوں ہوا کہ بس رستے میں ہی بند ہوگئی اور ڈرائیور نے کنڈکٹر سے کہا! اوئے طیفے کیا بات ہے۔ کنڈکٹر ڈرائیور کے پاس آ کر کہنے لگا استاد جی تیل تو ابھی ڈلوایا تھا پھر بس کیوں بند ہوگئی۔ پھر ڈرائیور خود بس سے نیچے اُترا اور خود بس کے نیچے مشکل سے ایسے داخل ہوا جیسے کسی غریب کا بچہ سکول میں داخل ہوتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور کنڈکٹر کی طرف منہ کر کے بڑے غصیلے انداز میں بولا! غضب ہوگیا۔ کنڈکٹر نے کہا کیا مطلب؟ ڈرائیور نے

کہا! کیا مطلب کے پتر یہ سب تمہارا قصور ہے۔ میں نے کل تم سے کہا بھی تھا کہ رسہ مضبوط ہونا چاہیے لیکن تم نے رسے کے بجائے اسے اپنی بیگم کے پرانے دوپٹے کے ساتھ باندھ دیا۔

ہم بڑے حیران ہوئے۔ ہم نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا مطلب رسہ مضبوط ہونا چاہیے اور پرانا دوپٹہ۔۔۔ ڈرائیور نے جواب دیا جناب پہلے تیل کی ٹینکی رِسے سے بندھی ہوئی تھی جو اَب ناکارہ ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے (کنڈکٹر سے) کہا! کہ رسہ مضبوط ہوگا تو ٹینکی گرنے کا خطرہ نہ ہوگا مگر اس کم بخت نے رسے کی بجائے اپنی بیوی کا پرانا جوؤں سے بھرپور اور تیل سے شرابور دوپٹہ لے کر اس کو بل دیئے اور اس کے ساتھ ٹینکی باندھ دی۔ اب وہ ٹوٹ گیا اور ٹینکی کہیں پیچھے گر گئی جتنی دیر بس کی نالیوں میں تیل رہا بس چلتی رہی اور پھر بس کی بس ہوگئی۔

میں نے ہنس کر جواب دیا بس جی ''کھیڈ مقدراں دی'' پھر ٹینکی تلاش کر کے لائی گئی اور پھر بس کے ساتھ دوبارہ مزید ظلم کیا گیا۔

اس قسم کی صورتِ حال سے نبرد آزما ہو کر میری ہیئت کذائی قابلِ دید ہوتی گھٹنے پتلون سے باہر جھانک رہے ہوتے اور مفت میں جدید ترین انگریزی سٹائل بن جاتا۔ ہمارے کالج گیٹ کے سامنے سے گزرنے والی لڑکیاں میری طرف بہت متوجہ ہوتیں اور ان میں سے بعض تو واقعی ''گزر'' ہی جاتیں۔

اور جب میں بالآخر کالج کی حدود میں داخل ہوتا تو کالج میں اُلو بول رہے ہوتے (پروفیسر حضرات سے معذرت کے ساتھ) مجبوراً میں افتاں و خیزاں واپسی کی

راہ لیتا تو مجھے دُور سے ہی ''لوکل بس'' کی سرخ ''خون آلود'' بتی میری طرف خونخوار آنکھوں سے جھانکتی دِکھائی دیتی۔ بالآخر میں پھر بس میں گُھس جاتا اور معمول کی کوفت سے بچنے کے لیے سونے کی کوشش میں آخر کار اُونگھنے لگتا اور اُونگھتا اُونگھتا ایک نئے ہی عالم میں جا پہنچتا جہاں ایک نئی صورتِ حال درپیش ہوتی۔

ع وہی تم ہو وہی ہم ہیں، نہ تم بدلے نہ ہم بدلے

○○○

کیا یہی پیار ہے؟

''مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔'' اس نے اپنے گیلے ہاتھوں سے جھاڑو پھینکتے ہوئے کہا۔ میں حیران ہوا کہ آج چھیمو کو کیا ہوگیا ہے؟ میں نے بھی اپنی تمام تر محبتوں کو آواز دے کر اس کی طرف دیکھا اور کہا ''میں بھی تمھیں چاہنے لگا ہوں۔''

اس نے یہ سنا اور ساتھ ہی زور سے آواز لگائی ''چاچی تیرے منڈے نوں میرے نال محبت ہوگئی اے۔''

میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ادھر ماں جی پرانے جوتے کو تلاش کر رہی تھیں تاکہ اسے میرے سر پہ استعمال کر سکیں۔ دراصل نئے جوتے کے معاملے میں وہ بہت حساس تھیں۔

میں نے بھاگنا چاہا تو وہ جھاڑو پکڑ کر میرے سامنے کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی۔

''باؤ! پیار تو قربانیاں مانگتا ہے تو جوتوں سے ڈر رہا ہے۔'' میری تو سٹی ہی گم ہوگئی تھی۔

میں کیا جواب دیتا میں نے آنکھیں بند کر کے دوڑ لگا دی مگر زمین بوس ہو گیا دراصل محترمہ چھیمو کی ٹانگ میری راہ میں حائل ہو گئی تھی۔ بعد ازاں پتا نہیں کیا ہوا؟ اچانک سر پر ''دھم'' کی آواز سے کوئی قہر نازل ہوا اس کے بعد ''چھک'' کی آواز سے کوئی آسمانی بلا نازل ہوئی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا ''دھم چھک دھم چھک'' ذرا ہوش آیا تو پتا چلا جھاڑو اور جوتے کے حسین امتزاج سے میرے سر پر کوئی دھن بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

چھیمو بہت عجیب لڑکی تھی۔ اس کا اور ہمارا گھر ساتھ ساتھ تھا زیادہ وقت وہ ہمارے گھر ہی رہتی تھی۔ اسے گھر کے کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ عجیب نوکرانہ طبیعت پائی تھی اس لیے وہ ہمارے گھر کا کام بھی بصد مسرت کر دیتی۔

ایک دِن میں نے اس سے کہا! ''مجھے کالج جانا ہے میری شرٹ اِستری کر دو۔'' اس نے بہت پیار سے شرٹ لی اور استری کر دی۔ میں اس کی فرمانبرداری پر انگشت بدنداں تو ہوتا مگر وقت کی کمی کے باعث یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور جلدی سے شرٹ پہن کر کالج چلا گیا۔ نا جانے کیوں اس دِن موسم ٹھنڈا ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ کالج پہنچتے ہی میرے دوست میرا مذاق اُڑانے لگے۔ ان سے مذاق اُڑانے کی وجہ ڈپٹ کر دریافت کی تو ٹھنڈے موسم کی حقیقت منکشف ہو گئی۔ شرٹ پر استری کے سائز کا روشن دان کھلا تھا۔ جس سے ہو اگزر کر میرے جسم و جاں کو ٹھنڈک ہی ٹھنڈک سکون ہی سکون بخش رہی تھی۔ اچانک برہنگی کا احساس شرمندہ کرنے لگا۔ میں نے جلدی سے دو روپے والا اخبار خریدا اور اسے چادر کی طرح لپیٹ کر گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔ گھر پہنچا تو صحن میں چھیمو ماں جی کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر میرا خون

کھول اُٹھا اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولی ''ماں جی! آپ کے بیٹے کو تو کپڑے خریدنے کا بھی ڈھنگ نہیں ہے باریک سے کپڑے لے آتا ہے ذرا اِستری لگاؤ تو جل جاتے ہیں۔'' میرے پاس وضاحت کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا۔ میں آنکھوں میں آنسو سمیٹے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

چھیمو بھی نہ جانے کیا شے تھی۔ ایک دِن جب شام کو میں صحن میں ابا جی کے پاس بیٹھا تھا اور وہ مجھے دین کی باتیں بتا رہے تھے تو اچانک میری نظر چارپائی کے پیچھے پڑی وہ وہاں چھپی بیٹھی مجھے اشارے کر رہی تھی۔ ابا جی بولے ''بیٹا! جب کوئی گھر میں آئے تو آپ کون سے مناسب الفاظ میں اسے خوش آمدید کہیں گے۔'' میں مکمل طور پر اس کے اشاروں میں محو تھا۔ پھر لاشعوری طور پر میں بولا ''او جا دفعہ ہو جا۔'' بس پھر کیا تھا ابا جی نے حقے کی نالی سے میری وہ پٹائی کی کہ نانی مرحومہ یاد آ گئی وہ کہہ رہے تھے۔ ''میں تو پہلے ہی انگریزی تعلیم کے خلاف تھا ستیاناس کر دیا ہے اچھے بھلے ذہن کا نہ کوئی تمیز نہ کوئی اخلاق اور نہ کوئی طریقہ۔۔۔'' ابا جی کی آواز میں چھیمو کے قہقہے بھی شامل تھے۔

اس طرح کے واقعات نے میری زندگی اجیرن کر دی تھی۔ ایک بار میں نے چھیمو سے کہا ''میں نے آخر تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' اس نے بہت لاپرواہی سے جواب دیا ''بگاڑا نہیں سنوارا ابھی تو کچھ نہیں۔'' اس کے اس طرح کے جملے میں کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔

جمعہ کے روز وہ صاف ستھرے سفید کپڑوں میں ملبوس شرماتی ہوئی میرے

پاس آئی میں نے کہا! ''چھیمو آج تم اس لباس میں بہت اچھی لگ رہی ہو تو اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا ''باؤ کیا میں تمہیں صرف لباس میں ہی اچھی لگتی ہوں۔'' میں حیران تھا آج اسے کیا ہو گیا ہے۔ پھر اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا جس میں اس نے ایک ہار پکڑا ہوا تھا بہت شرما کر بولی ''باؤ! میں تیرے لیے تحفہ لائی ہوں۔'' میں نے شکر ادا کیا کہ اسے بھی عقل آ گئی ہے۔ پھر وہ بولی ''میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں پہناؤں گی۔'' میں بولا ''چلو ٹھیک ہے پہنا دو۔'' وہ کہنے لگی ''پہلے آنکھیں بند کرو۔'' میں نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے ہار میرے گلے میں پہنایا اور کہنے لگی ''اسے کبھی نہ اُتارنا۔'' میں اس کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر ساری پرانی باتیں بھول گیا اور بولا ''میں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔ وہ باہر صحن میں چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے صحن میں گیا تو دیکھا ابا جی بہت پریشان پھر رہے تھے اور چیخ چیخ کر ماں جی سے نا جانے کیا پوچھ رہے تھے اور میں چھیمو کے سحر میں گرفتار خلاؤں میں گھور رہا تھا۔

پھر ابا جی نے چھیمو سے پوچھا ''او کڑیے میری تسبیح تے نئیں دیکھی۔'' تو وہ فوراً بولی چاچا جی! باؤ نے گلے میں پہنی ہوئی ہے۔'' اور پھر ابا جی آگ بگولہ ہو کر میری جانب لپکے اور بالوں سے پکڑ کر جائے نماز پر جا پٹخا اور گھٹنا میرے سر پر رکھ دیا اور پوری محویت، خضوع و خشوع کے ساتھ تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو گئے اور جیسے ہی وہ تسبیح کا ایک پھیرا پورا کرتے اور با آوازِ بلند ''اللہ اکبر'' کہتے اور ساتھ ہی میرے سر پر ایک چپت رسید کرتے اور اس طرح عبادت و حجامت کا یہ سلسلہ ایک گھنٹہ جاری رہا۔

میرے شب و روز گزرتے گئے۔ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یونیورسٹی کا ماحول بہت عجیب تھا۔ لڑکے لڑکیوں سے نوٹس لینے کے بہانے سے باتیں کرتے اور اگر کوئی اُن کا بروقت ''نوٹس'' نہ لیتا تو بعد میں وہ نجانے کیا کرتے۔ میں نے بھی دوسروں کی طرح نوٹس کی پرواہ کیے بغیر ایک دِن ہمت کر کے اپنی کلاس کی سب سے خوبصورت لڑکی سے نوٹس کا مطالبہ کیا اور وعدہ کیا کہ دو دِن کے بعد واپس کر دوں گا۔ دوسرے دن شدید بارش ہوئی۔ میں اپنے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ گلی میں بچوں کا شور اور قہقہے موسلا دھار بارش کی آواز کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا تو چھیمو بچوں کو کاغذ کی کشتیاں بنا بنا کر دے رہی تھی۔ اچانک ایک خوف کی لہر چہرے اور بدن میں دوڑ گئی اور اپنے خدشے کی تصدیق کرنے کے لیے میں نے کشتیوں کو غور سے دیکھا تو میرؔ اور غالبؔ اپنے اشعار سمیت بارش کے گندے پانی پر تیر رہے تھے۔ میں نے زور سے آواز دی چھیمو !! تو چھیمو لاپرواہی سے بولی! باؤ آ جا بڑا مزہ آ رہا ہے اور وہ نیلے رنگ کی کتاب بھی لے آ اس کے صفحے بڑے ملائم ہیں کشتیاں بہت اچھی بنیں گی۔ میں نے چیخ کر کہا ''چھیمو میں خودکشی کرنے لگا ہوں تم نے میری زندگی تباہ کر دی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے پنکھے کے ساتھ رسّی لٹکائی اور پھندا بنانے میں مصروف ہو گیا اچانک وہ اندر آئی اور اس نے پنکھا چلا دِیا۔ رسّی میرے پیروں میں اُلجھ گئی اور گھومتے ہوئے پنکھے نے میرے پاؤں کھینچے تو میں نیچے جا گرا۔ وہ زور زور سے ہنس رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''باؤ گلے میں رسّی ڈالتے ہیں پیروں میں رسّی ڈالنے سے خودکشی نہیں ہوتی۔''

اس واقعے کو دو ہفتے گزرے تھے کہ ماں جی میرے پاس آئیں اور میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہنے لگیں ''میرا بیٹا ماشاءاللہ ایم۔اے میں ہو گیا ہے۔اب تیری شادی ہو جانی چاہیے۔میں نے تیرے لیے ایک چاند سی لڑکی ڈھونڈی ہے۔''

میرے دِل میں خوشی سے لڈو پھوٹنے لگے۔مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میری زندگی کا مقصد مجھے ملنے والا ہے۔کتنی خواہش تھی کہ میری بھی کوئی دُلہن ہو جو مجھ سے محبت کرے مجھے کبھی دُکھ نہ دے پیاری پیاری باتیں کرے۔یہ اچھے اچھے خیالات میرے ذہن میں دھمال ڈالنے لگے اور پھر خوشی سے شرماتے ہوئے میں نے ماں جی سے پوچھا کون ہے وہ لڑکی؟ ماں جی نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا ''اوا پنی چھیمو'' ماشاءاللہ دیکھی بھالی ہے۔گھر کی لڑکی ہے، سگھڑ ہے، محبت کرنے اور کام کرنے والی ہے۔'' ماں جی کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔چھیمو بجلی بن کر میرے اعصاب پر گری تھی۔میں نے اپنا بوریا بستر اُٹھایا اور اسٹیشن کی جانب بددِلی سے چل دیا اور گاڑی پر سوار ہو کر نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔گاڑی چلی تو مجھے ٹھنڈی ہوا محسوس ہونے لگی۔میں سوچ رہا تھا کہ نا جانے سردی زیادہ کیوں لگ رہی ہے۔پھر معلوم ہوا کہ یہ ہوا میری کمر پر پڑ رہی ہے اور میں سوچ رہا تھا کہ ''کیا یہی پیار ہے؟''

○○○

اولڈ پیپل نیو ہاؤس

زندگی کی یکسانیت سے مضطرب ہو کر میں شام کے بڑھتے ہوئے سائے کا ہاتھ تھامے مال روڈ پر خراماں خراماں رواں دواں تھا۔آج سڑک پر بائیں جانب پیلے رنگ کا بورڈ نا جانے کیوں اچانک مجھے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔''اولڈ پیپل ہاؤس'' شاید اس بورڈ پر یہی درج تھا۔تیر کا اشارہ کسی شوخ حسینہ کی آنکھ کا اشارہ لگ رہا تھا اور میں آخر اس کے دام میں آ ہی گیا اور اس کے دھیان کا دامن پکڑے ایک سفید عمارت میں جا پہنچا۔اس عمارت کے برآمدوں میں ہر طرح کے بوڑھے کھانسی کا راگ الاپتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔مجھے دیکھتے ہی وہ ایسے چوکنے ہوئے جیسے روزہ دار افطاری کے سائرن سے ہوتے ہیں۔ہر کسی کی نگاہوں میں کسی اپنے پیارے کا عکس مسکرا رہا تھا۔

ایک بوڑھا جو شاید چونیاں کے کسی گاؤں سے آیا تھا بلند آواز میں ہیر وارث شاہ گا رہا تھا۔جب وہ ہیر آکھیا کہتا تو یوں محسوس ہوتا کہ ہیر حالتِ نزع میں وصیت لکھوا رہی ہے۔یہ شاید وہی ہیر تھی جس کی سیاہ زلفوں کے سائے اب بھی چونیاں

کے بابے کی سیاہ آنکھوں میں دیکھے جا سکتے تھے۔

میں نے ہمت کرتے ہوئے بابا جی کے قدموں میں بیٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے کہا ''کرمو آج تم نے بالوں کو خضاب لگا لیا ہے۔'' غالباً وہ مجھے بھی کوئی بابا ہی سمجھ رہا تھا۔ میں نے کہا ''بابا جی میں کرمو نہیں ہوں۔ میں تو ویسے ہی آپ کے پاس دُعا سلام کرنے کے لیے آ گیا ہوں۔ بابے نے اپنی خزاں زدہ داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ''آج سے سات سال پہلے میں بھی ایسے ہی اِدھر آ گیا تھا مگر اب ایسے ہی باہر نہیں جا سکتا پھر انہوں نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا! تیری اولاد بھی پڑھ لکھ گئی ہو گی۔ چار پیسے آ گئے ہوں گے ان کے پاس اس لیے تو اس سفید قبر میں آ گئے ہو۔'' میں نے اولڈ پیپل ہاؤس کی دیواروں کو نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو وہ ساری سفید تھیں۔ واقعی مجھے ایسے لگا کہ جیسے کسی زندہ شخص کو زبردستی کفن پہنا دیا گیا ہو۔ میں نے کہا ''بابا جی میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔'' بابا جی نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا ''اچھا ہے میاں! ہم نے شادی کر کے کون سا تیر مار لیا۔''

مجھے اس بابے سے انسیت سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے کہا ''بابا جی آپ کے کتنے بچے ہیں'' انھوں نے جواب دیا ''ایک مجسٹریٹ، دو سیکرٹری اور ایک بزنس مین چار ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی میرا بچہ نہیں رہا انھیں زمانے نے اغوا کر لیا ہے اور ان سے بیگار لے رہا ہے۔

اتنے میں ایک اور بوڑھا جس کا جسم عمر کے بوجھ سے جھکا ہوا تھا جھومتا ہوا ایسے چل رہا تھا جیسے اپنی لاٹھی کو پکڑے ہوئے زمین پر ٹیک ٹیک کر چل رہا ہو۔ میں نے غور سے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی ہی نہیں جھومتا جھومتا ہچکولے کھاتا

آخر کار وہ چارپائی پر پہنچ ہی گیا۔ اس نے اپنے وجود کو چارپائی کے جھولے میں ڈال دیا۔ اس اچانک حملے سے چونیاں کا بابا گرتے گرتے بچا۔ اس نے بہت غصے سے ہوا میں مُکا لہرایا جو کہ ہوا سے ہی ہوتا ہوا واپس آ گیا۔ پھر اپنی افسردہ آواز میں بولا ''یار! معاف کرنا اگر زور سے لگ گیا ہے تو تجھے تو معلوم ہے میں اپنے پنڈ کا چودھری ہوں۔ نووارد بابے نے کہا۔ چودھری جو سوکھی روٹی اور کچی دال میں کھاتا ہوں وہی تم کھاتے ہو، جو پیلا پانی میں پیتا ہوں وہی تم پیتے ہو تم کہاں کے چودھری ہو۔

چونیاں کے بابے نے کہا! ''او چودھری، چودھری ہوتا ہے ایک فون کر کے تمہیں اندر کروا دوں۔''؛ ''او جا چودھری دو ٹیلی فون کر کے تم خود اگر باہر چلے جاؤ تو میں مانوں۔''؛ ''او یار یہ بات نہیں اصل میں میرے پوتوں کو میرے ہاتھوں سے چلم کی بو آتی تھی اور انھیں اکثر نزلہ رہتا تھا لہٰذا میں خود اِدھر آ گیا ہوں۔''

''ارے چودھری خود آنے والوں کے ساتھ چار بندے نہیں آتے اور نہ ہی جمع کروانے کی رسید وصول کرتے ہیں۔''

''او بس او بس، زیادہ بحث نہ کر۔ ٹھیک ہی کہتے تھے سیانے پیٹ بھرا ہوا غریب آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔''

''او یار چودھری تم آپے کی بات کرتے ہو ہمیں تو دُنیا سے باہر نکال دیا گیا ہے۔''

''او کر مو چودھری، چودھری ہی ہوتا ہے چاہے قبر میں کیوں نہ ہو۔''

ابھی میں ان بابوں کی لرزتی ہوئی بحث کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تیز سیٹی کی آواز آئی اور اولڈ پیپل ہاؤس کا ایک ملازم بھاگتا ہوا برآمدے میں آیا اور اُونچی

اُونچی آوازیں لگانے لگا ''بابیو! لنگر کھل گیا جے۔'' چونیاں کے چودھری بابے نے کرمو کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا! ''کیا کہتا ہے یہ ڈنگر کھل گیا جے؟'' ''چودھری صاحب اسے دیکھ کر تو ایسے لگتا ہے جیسے کوئی ''چنگڑ'' کھل گیا جے۔ آؤ چودھری صاحب روٹی کھالیں۔''

دونوں بابوں نے جھٹکے سے چارپائی سے اُٹھنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے مگر ان کی دھوتیاں اُلجھی ہوئی تھیں۔ جنھیں بہت سلیقے سے انھوں نے علیحدہ کرلیا۔ میں وہاں سے اُٹھا اور ملازموں سے بچتا ہوا میس میں جا پہنچا۔ سٹیل کے ڈونگوں میں پتلا دلیہ اور پھیکی کھچڑی بابوں کو منہ چڑا رہی تھی۔ چونیاں کے بابے نے خانساماں سے کہا ''یار کبھی اچھا کھانا بھی کھلا دیا کر خانساماں بولا! ''بابا جی میں پاکستان بننے سے کا پہلے بھی کھانا بنا رہا ہوں'' کرمو بولا! ''اچھا تو پھر ہمیں اب کیوں کھلا رہے ہو اب تک تو وہ سارے ہی خراب ہو گئے ہوں گے۔''

چونیاں کا بابا لرزتی ہوئی آواز میں بولا! ''مجھے لگتا ہے یہ کھانا کم بناتا ہے ہمیں بے وقوف زیادہ بناتا ہے وہ پہلے والا باورچی اچھا تھا۔'' پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کہنے لگا ''یہاں تو باورچی بھی موسموں کی طرح بدلتے رہتے ہیں۔''

کرمو بولا! ''چودھری صاحب اب تو ہماری زندگی تاش کے پتوں کی طرح ہے کبھی کسی کے ہاتھ میں اور کبھی کسی کے ہاتھ میں۔''

پھر کھانا کھانے کا انوکھا مظاہرہ شروع ہوا۔ اوّل تو چمچ میں دلیہ آتا ہی نہیں تھا اور اگر آ بھی جاتا تو منہ تک پہنچتے پہنچتے آدھا رہ جاتا۔ جس میں سے آدھا داڑھی مونچھوں میں اُلجھ جاتا اور جو تھوڑا سا منہ میں پہنچتا وہ ٹوٹی ہوئی داڑھوں کے پوشیدہ

خانوں میں کہیں کھو جاتا۔

یہ تماشا ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ ابھی کوئی بھی سیر نہیں ہوا تھا مگر تھکن کی وجہ سے مزید کھانے کی کوشش سے ہر کوئی گریز کر رہا تھا۔ میں نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور نا جانے کیوں تین مرتبہ چوم لیا۔ زندگی پہلی مرتبہ اتنی سست اور لاچار حالت میں میرے سامنے آئی تھی۔ میں واپس صحن میں پڑی چارپائی کے قریب بیٹھ گیا۔ دو گھنٹے کے کٹھن سفر کے بعد وہ دونوں بابے چارپائی تک ایسے پہنچے جیسے پاکستان میں مکتوب الیہ کو اس کا خط پہنچتا ہے اور پھر دونوں بابے انداز ے ہی سے بیٹھ گئے۔ چودھری نے کہا ''لے بھئی کرمو! اب حقہ پینے کو جی چاہ رہا ہے۔''

کرمو بولا ''چودھری صاحب آپ کے بقول حقہ آپ کا پہلے ہی دشمن ہے جس کی وجہ سے آپ کا ''حقہ پانی'' بند ہوا ہے اور ویسے بھی حقے کا دُھواں آپ کے لیے نقصان دہ ہے۔''؛ ''او کرمو! میرا دماغ خراب نہ کر یہ لوگ جو سڑکوں پر روزانہ سو ڈیڑھ سو رکشے پی جاتے ہیں۔ ان کے دھوئیں میں کیا آبِ حیات مِلا ہوتا ہے۔''

کرمو نے آہ بھری اور کہنے لگا! ''او چودھری صاحب نہ ایسی خواہشیں کیا کریں جو پوری نہیں ہو سکتیں۔'' یہ جملے سنتے ہی چونیاں کے بابے کی آنکھوں میں گھٹائیں جھومنے لگیں ''او یار! پیپل کی ٹھنڈی چھاؤں ہوتی تھی اور کچے گھڑے کا میٹھا پانی۔ میں پورے تین میل پیدل چل کر بغیر تھکے کنویں کے پاس بیٹھ جاتا۔ میرے بیل مجھے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے جیسے میری طاقت سے حسد کر رہے ہوں۔ پسینے سے نچڑے ہوئے کُرتے کو جب کبھی ہوا کا جھونکا چُھو کر گزرتا۔ اس کی ٹھنڈک میری رُوح تک جا پہنچتی اور پھر گڑتمبا کو کا میٹھا دُھواں مجھے تازہ کر دیتا۔ میں نے آج تک

اپنے بچوں کو اپنی زمینوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا سارا کام میں خود ہی کرتا تھا۔ وہ صرف پڑھتے تھے۔ ان کی تعلیم مجھے بہت عزیز تھی۔ اب مجھے افسوس ہے کہ اگر ان کے ہاتھ بھی کھیتوں کی نرم مٹی کے عادی ہوتے تو شاید انھیں اس مٹی سے بھی محبت ہوتی اور وہ اتنی بے دردی سے اسے بیچ نہ دیتے۔ انھوں نے زمین ہی نہیں بیچی بلکہ میرا اور میرے باپ دادا کا خون پسینہ بھی بیچ دیا ہے جس کی وجہ سے پورے گاؤں میں ہماری فصل سب سے اچھی ہوتی تھی۔ او کرمو! ''سوں ربّ دی'' ہم نے کبھی کھاد استعمال نہیں کی۔ مجھے اپنے خون پسینے پر پورا اعتماد تھا۔''؛ ''او چودھری وقت وقت کی بات ہے۔ اب تو لوگ پسینہ ختم کرنے کے لوشن استعمال کرتے ہیں۔''

''کرمو تجھے پتا ہے۔ میں بیس میل پیدل چل لیا کرتا تھا۔''

''او چودھری اب تو تمھیں دس قدم چلنے کے لیے بیس دفعہ رُکنا پڑتا ہے۔''

''کرمو تو، تو اس طرح کہہ رہا ہے جیسے تو ابھی گھوڑا ریس جیت کر آیا ہے۔ ابھی میں تیرے سے تیز چل لیتا ہوں۔''

''او یار چودھری ہم باہر کب جائیں گے۔''

''کرمو! چار بندے ہی اُٹھا کے لے جائیں گے تو جائیں گے۔''

میں ان کی باتوں میں محو تھا کہ پھر اچانک مقابلہ کھانسی شروع ہوا موٹی پتلی، اُونچی نیچی آوازوں میں بابے ایسے کھانس رہے تھے جیسے موٹر سائیکل کا چین ڈھیلا ہو گیا ہو۔ پھر اچانک عشاء کی اذان ہوئی تو بابے یوں خاموش ہو گئے جیسے رُکی ہوئی ہوا میں درخت۔

کرمو نے پوچھا ''چودھری صاحب کیا خیال ہے نماز نہ پڑھ لیں''؛ ''او یار

نماز تو بندہ پڑھ لے مگر جب سجدے میں جاتا ہوں تو اُٹھا نہیں جاتا''؛ ''چودھری تو، تو پھر ولی اللہ ہو گیا ہے اتنے لمبے سجدے کرتا ہے۔''

''کرمو میں اتنے لمبے سجدے کرتا نہیں ہو جاتے ہیں۔''

رات بھی ان کے مقدر کی طرح مزید سیاہ ہو رہی تھی۔ میں نے اس داستانوی ماحول سے واپس دُنیا میں آنا چاہا تو معلوم ہوا کہ اولڈ پیپل ہاؤس کا مین دروازہ بند ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسے لگا کہ جیسے میری زندگی جلدی سے کسی نے بسر کر لی ہے اور میں اپنے بوڑھے چہرے کو دُنیا کی نظروں سے چھپاتا پھر رہا ہوں۔ اندھا دھند بھاگتے ہوئے میں مین دروازے تک پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کی مگر خاکی انسان فولاد سے کیسے ٹکر لے سکتا ہے۔ میں دیوار پر چڑھا اور باہر کی طرف چھلانگ لگا دی۔ مال روڈ پر اِکا دُکا گاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ رات خاصی بیت چکی تھی۔ میں دیوانہ وار بھاگتے ہوئے اپنے گھر پہنچا تو رات کے سیاہ بال پوری گلی میں پھیلے ہوئے تھے۔ خوف کا زہر میری سانسوں کو مضمحل کر رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر دستک دینا بہت اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ہمت کر کے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھلا ہوا تھا۔ صحن میں دادا جی چارپائی پر بیٹھے نا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ میں نے بے اختیار ان کو گلے لگا لیا۔ دادا جی بولے! ''یار جلدی گھر آ جایا کر تو خود تو چلا جاتا ہے اور ساتھ میری نیند بھی لے جاتا ہے۔''

پھر میں ساری رات دادا جی کے پاؤں دباتا رہا۔ ان کے مٹی رچے پاؤں میرے ہاتھوں میں کستوری بن کر مہک رہے تھے۔ پھر صبح طلوع ہوئی۔ طلوعِ سحر کے تمام رنگ قوسِ قزح کی طرح میرے ذہن کے گوشوں میں چمک رہے تھے۔ پہلے تو کبھی صبح اتنی حسین نہ تھی!

مُک مُکا

برسات کا موسم تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ میں موٹر سائیکل پر نہر والی سڑک سے گزر رہا تھا۔ بہت سی نظموں اور غزلوں کے مصرعے گنگنانا چاہتا تھا مگر موسم خود غزل بنا ہوا تھا۔ موسم کو بھی گنگنانے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے!

اچانک کالے پیلے رنگ کی چھ فٹ کی مخلوق سڑک پر نمودار ہوئی اور ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھے رُکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اچانک موٹر سائیکل کی بریک لگائی تو موٹر سائیکل پھسل گئی اور میں سڑک پر پھسلتے ہوئے ان کے قدموں میں جا گرا۔

اپنے حواس قائم ہوئے تو دیکھا یہ تو عوام کے خادم پولیس والے ہیں۔ ایک پولیس والا آگے بڑھا، مجھے بازو سے پکڑ لیا اور گاڑی کی طرف منہ کر کے زور سے چلایا!

''صاحب جی گرفتاری ہوگئی''۔ میں پریشان تھا کہ یہ آخر کون گرفتار ہو گیا۔ میں نے پوچھا! ''کیا ہوا'' بولا! ''پکڑے گئے ہو''

پوچھا! ''کیوں

جواب آیا! ''قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

میری نظریں بے اختیار اس کے ہاتھوں میں اُلجھ کر رہ گئیں مگر ہاتھ تو زیادہ لمبے نہیں تھے۔ وہ بولا! ''موٹر سائیکل کے کاغذات دِکھاؤ'' کاغذات دِکھا دیئے۔ پھر بولا! ''لائسنس دِکھاؤ'' وہ بھی موجود تھا۔ پھر بولا! ''اور تمہارے ساتھ کون ہے؟''

جواب دیا! ''میرے ساتھ تو میرا اللہ ہی ہے۔''

جواب میں بولا! ''تمہیں پتا نہیں ڈبل سواری پہ پابندی ہے۔''

اس بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

انھوں نے میری خاموشی سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے پولیس کی گاڑی میں بٹھایا اور موٹر سائیکل پر ایک بہت بڑا پیٹ جس کے ساتھ ایک شخص لگا ہوا تھا۔ براجمان ہو گیا۔ میں نے پوچھا ''کہاں چلنا ہے۔''

جواب ملا ''پولیس اسٹیشن''

میں نے کہا ''یہیں بات ختم کر لو۔''

کہنے لگا ''جس جگہ پر بات شروع ہوتی ہے وہاں پر بات ختم کرنا ہماری توہین ہے کیونکہ ہم بہت ایماندار ہیں۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے صدائے احتجاج بلند کی بے ایمان تو میں بھی نہیں ہوں، وہ بولا ''قانون کی برابری کرتے ہو۔''

میرا ذہن پھر لفظوں میں اُلجھ کر رہ گیا۔ میری خاموشی سے گھبرا کر وہ بولا ''تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں۔''

میں نے کہا ''اتفاق سے میں پرس گھر بھول آیا ہوں۔''

اس نے میری جیبوں کو ٹٹولا تو ایک سگریٹ برآمد ہوا جو نا جانے کب کا میری جیب میں بے ہوش پڑا تھا۔ اس نے سگریٹ کو سونگھا اور بولا ''چرس پیتے ہو۔''

میں نے جواب دیا ''جناب یہ تو سادہ سگریٹ ہے۔''

بولا ابھی پتا چل جاتا ہے اور وہ سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ جب سگریٹ ختم ہوگیا تو کہنے لگا! ''یہ تو واقعی سادہ سگریٹ ہے۔'' اور پھر بولا ''اور کیا ہے تمہارے پاس۔''

میں نے کہا ''بہت کچھ ہے۔''

جھٹ سے بولا ''جلدی دِکھاؤ۔''

میں نے کہا ''ماں باپ کی دُعائیں ہیں جو دِکھائی نہیں جاتیں۔''

لیکن ان کی نظریں میری نئی شرٹ پر جمی ہوئی تھیں۔

پھر اچانک بولے ''یہ نئی شرٹ ہے۔''

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنا اکلوتا سگریٹ یاد آ گیا اور اس کا انجام بھی میرے سامنے تھا۔ میں خاموش ہو کر رہ گیا۔

اتنے میں تھانے کی یرقان زدہ عمارت آ گئی اور مجھے حوالات میں دھکیل دیا گیا۔ وہاں تھانے میں بھی ان قوم کے محافظوں نے اپنے صندوق کو زنجیروں سے باندھ کر تالا لگایا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا! ''جناب میرا قصور کیا ہے؟'' بولا! ''قصور تو قصوریوں کا ہے۔ جنھوں نے قصور بنایا ہے۔ تو مجھے یہ بتا یہ جو تیرے ساتھ دوسرے لوگ بیٹھے ہیں ان بے چاروں کا کیا قصور ہے؟'' میرے پاس اس دفعہ بھی اُس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد تھانے کی عمارت مردانہ چیخوں سے گونج اُٹھی کوئی چیخ رہا تھا

''صاحب جی میں نے اپنی بیوی کو نہیں مارا۔''

حوالدار کی آواز آئی! ''یہی تو میں پوچھتا ہوں کہ تو نے اپنی بیوی کو کیوں نہیں مارا؟''

جواب میں آواز آئی! ''صاحب جی! آج کل تو عورتوں کو بالکل بھی کچھ نہیں کہنا چاہیے کیونکہ اُن کے بل پاس ہوئے ہیں اور میں اپنی بیوی کو کیسے مار سکتا ہوں کیونکہ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں اپنی بیوی کو ضرور ماروں گا لیکن آپ مجھے چھوڑ تو دیں۔''

حوالدار کی آواز گونجی! ''اوکا کا سپاہی یہ تو کنوارہ قیدی ہے۔ کوئی شادی شدہ قیدی لے کر آؤ۔''

میں حیران تھا کہ آخر حوالدار کو کسی کی بیوی سے اتنی ہمدردی کیوں ہے؟

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کا کا سپاہی مجھے بازو سے پکڑ کر حوالدار کے پاس لے گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اپنی پیاری سی بیوی کا چہرہ آ گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی حوالدار نے پوچھا! ''تم نے اپنی بیوی کو کیوں مارا؟''

میں بولا! ''جناب وہ گھر میں میرے لیے کڑاہی گوشت بنا رہی ہے۔ آپ فون کر کے پتا کر لیں۔''

وہ بولا! ''تم کیا کرتے ہو۔''

میں نے جواب دیا! ''جناب محکمہ انٹی کرپشن میں ملازم ہوں۔'' بس پھر یہ سننا تھا کہ اس کا رنگ فق ہوگیا وہ بولا! ''جناب آپ کیسے تشریف لائے ہیں۔''

میں نے جواب دیا! ''آیا کہاں ہوں لایا گیا ہوں۔''

بولا! ''کون پاگل کا بچہ آپ کو لے آیا ہے۔''

میں نے جواب دیا! ''آپ کا سٹاف مجھے نہر والی سڑک سے اُٹھا کر لے آیا ہے۔ میری موٹر سائیکل بھی ان کے پاس ہے۔''

حوالدار نے چلّا کر کہا! ''او کا کا سپاہی صاحب کی موٹر سائیکل میں پٹرول واپس ڈال دو، بیٹری بھی لگا دو اور چابی کا چھلا بھی واپس لگا دو اور یہ سب چیزیں دوسری ساتھ والی موٹر سائیکل سے نکال بھی لینا۔ تم اکثر بھول بھی جاتے ہو۔'' اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ''خبیثو! بندہ دیکھ کر پکڑا کرو کتنی بار کہا ہے میں نے تم سے، جسے جی چاہتا ہے اُٹھا کے لے آتے ہو۔ جاؤ آج کی دیہاڑی میں سے چکن کڑاہی لے کر آؤ اور یاد رکھو پیسے صرف تمہارے حصے کے کم ہوں گے۔'' مجھے ڈر تھا اس مُک مُکا پر کہیں یہ ''مُکا مُکی'' نہ ہو پڑیں۔

میں پولیس کے اس حیران کن مُک مُکا پر حیران ہو گیا۔ تھانے سے جب باہر آیا تو یوں محسوس ہوا کہ میں دوبارہ انسانوں کی بستی میں آ گیا ہوں اگرچہ باہر بارش رُک چکی تھی اور فضا بھی آلودہ ہو چکی تھی۔ مجھے کسی غزل یا نظم کا کوئی مصرعہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ اب تو میں موسم کو بھی گنگنا نہیں سکتا تھا۔

○○○

''ہو جائے گا''

امیر بخش جب دُنیا میں آنے والا تھا تو اس کے والدین بہت پریشان تھے۔ ہر ملنے جلنے والا انھیں کہتا ''فکر نہ کریں سب اچھا ہو جائے گا'' اور آخر کار وہ ہو تو گیا مگر اچھا ہوا یا برا یہ معلوم نہ ہو سکا!

جب وہ سکول جانے لگا تو اس نے اپنے باپ سے کہا! ''مجھے سائیکل لے دیں۔''

باپ نے پر اعتماد لہجے میں کہا! ''تیرے سائیکل کا انتظام بھی ہو جائے گا۔''

چنانچہ اس نے میٹرک کر لیا تو پاکستان میں سائیکلیں بننا شروع ہو گئیں مگر وہ تو پھر بھی پیدل ہی رہا۔ میٹرک کے رزلٹ کے بعد جب اس نے اپنے ابا سے کہا کہ ''مجھے کسی کالج میں داخلہ لے دیں'' تو اس کے ابا نے بصد اطمینان کہا ''ہو جائے گا!''

مگر پیسوں کی کمی کے باعث اسے ایک بار پھر محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے باپ نے اسے ٹائپنگ سیکھنے کے لیے ایک ادارے میں بھیج دیا اور ادارے کے

پرنسپل نے بھی یہ کہا کہ ''آپ کا بیٹا انشاء اللہ ایک مہینے میں ٹرینڈ ہو جائے گا۔'' مگر دو سال تک اس کی ٹائپنگ سپیڈ پچیس سے اُوپر نہ گئی۔ مایوس ہو کر امیر بخش نے اپنے باپ سے کہا ''ابا جی اب میری شادی کر دیں۔''

کیونکہ اس کے نزدیک یہ کام سب سے آسان تھا اور جو ''ہو جائے گا'' کی نذر ہونے سے بچ سکتا تھا مگر باپ نے جواب دیا ''پہلے کچھ کمائی کر لو پھر تمہارا بیاہ بھی ہو جائے گا۔''

چنانچہ بادلِ نخواستہ وہ ایک کمپنی میں ملازم ہو گیا مگر تنخواہ کم تھی۔ اس نے اپنے منیجر سے کہا ''سر یہ بہت کم تنخواہ ہے اس میں تو اضافہ کر دیں۔'' منیجر نے لاپرواہی سے کہا ''پہلے کچھ کام تو کر کے دِکھاؤ پھر اضافہ بھی ہو جائے گا۔''

اس کا جی چاہتا تھا کہ ''ہو جائے گا'' کو کاغذ پر لکھ کر عین شہر کے وسط میں جلا کر جوتے مارے لیکن مرتا کیا نہ کرتا اس نے نوکری جاری رکھی۔ اتفاقاً اسے اپنے دفتر کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی۔ امیر بخش نے اپنے باپ سے کہا کہ ''میری اس لڑکی کے ساتھ شادی کروا دیں۔'' تو باپ نے کہا ''بیٹا بے فکر رہو وہ لڑکی کہیں نہیں جاتی اس سے تمہاری شادی بھی ہو جائے گی۔''

اور مہینے بعد اس لڑکی کی واقعی شادی ہو گئی لیکن کسی اور کے ساتھ! اس طرح لفظ ''ہو جائے گا'' کے ساتھ امیر بخش کی نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ ''ہو جائے گا، ہو جائے گا'' کی تکرار سن کر وہ عاجز آ چکا تھا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات! ہوتے ہوتے چالیس سال کی عمر میں اس کی شادی ہو ہی گئی۔ وہ بہت خوش تھا چلو کچھ تو ہو گیا، مگر ''ہو جائے گا'' کی برکات نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا عین شادی کے موقع پر

جب وہ گھوڑے پر سوار تھا تو حلوائی بھاگتا ہوا اس کے باپ کے پاس آیا اور بولا! ''جناب آپ کی طرف مٹھائی کے پیسے رہتے ہیں۔''

باراتیوں میں سے ایک صاحب بولے ''یار! یہ شادی کا موقع ہے تمہارے پیسے تمہیں مِل جائیں گے مرے کیوں جاتے ہو!''

حلوائی بولا! ''جناب میں شادی کی مٹھائی کی بات نہیں کر رہا ہوں بلکہ اُس مٹھائی کی بات کر رہا ہوں جو دولہا کی پیدائش پر بانٹی گئی تھی۔'' امیر بخش غصے سے بولا! ''ابا جی! آپ اتنے جلد باز لوگوں سے چیزیں نہ لیا کریں۔'' اس کے باپ نے حلوائی کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا ''فکر نہ کرو رقم کا انتظام ہو جائے گا۔'' غالبؔ نے ٹھیک ہی کہا تھا:

ع ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہونے والا کام آخر ہو کر ہی رہتا ہے اور شادی کے پورے ایک سال بعد امیر بخش کے ہاں بھی بیٹا پیدا ہوا۔ امیر بخش بہت خوش تھا۔ مٹھائی لینے کے لیے حلوائی کے پاس گیا تو حلوائی نے کہا ''بے فکر رہیں جناب! آپ کا مطلوبہ سامان بھی تیار ہو جائے گا۔'' اور اس جملے کا مطلب وہ بخوبی جانتا تھا لہٰذا خالی ہاتھ واپس گھر آ گیا۔ بیٹے کے نام کے بارے میں صلاح مشورے شروع ہو گئے جو غریب لوگ حسبِ معمول ہر سال کرتے ہی رہتے ہیں کیونکہ ان کے بچوں کی رفتار بھی فرحت عباس شاہ کی کتابوں کی سی ہوتی ہے۔ اس صلاح مشورے کی طوالت سے اس کے والد صاحب عاجز آ گئے۔ آخر ایک دِن غصے سے چلائے ''او! نام بھی ہو جائے گا پہلے اس کی جنم پرچی تو بنوا لو۔''

اور امیر بخش اپنے بے نام بیٹے کے بارے میں سوچتا ہوا گھر سے باہر نکلا رکشہ میں بیٹھا اور اس سے کہا ''کارپوریشن کے دفتر تک کتنا کرایہ ہوگا؟'' رکشے والے نے رکشہ سٹارٹ کیا اور کہا ''او باؤ جی! بیٹھو کرایہ بھی ہو جائے گا۔''

کارپوریشن کے دفتر پہنچ کر رکشہ والے نے کہا ''باؤ جی ایک سو چالیس روپے ہو گئے۔'' امیر بخش بولا ''یہاں تک تو تیس روپے کرایہ ہے۔''

رکشہ والے نے کہا ''یہاں پر لوگ اپنے بچوں کی جنم پرچی بنوانے آتے ہیں خوشی کا موقع ہے ایک سو تیس روپے دے دیں۔''

امیر بخش شاید کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ اس نے رکشہ والے کو ایک سو تیس روپے دے دیئے اور دفتر میں داخل ہو گیا۔ مطلوبہ کلرک کی میز غربا کی جیب کی طرح خالی تھی اور میز کے پاس پڑی ہوئی کرسی اُسے مسلسل منہ چڑا رہی تھی۔ چار گھنٹے بعد کلرک صاحب آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور بولے ''یار! پھر بچہ ہو گیا حکومت کہہ کہہ کر تھک جاتی ہے مگر تم لوگوں کو ہم سے ضد ہے کہ یہ فارغ نہ بیٹھیں۔''

امیر بخش غصے سے بولا ''یار! میرا پہلا بچہ ہے۔''

کلرک زور سے بولا ''پہلا ہے آخری تو نہیں ہے نا۔ اگلے سال پھر تم یہیں پر بیٹھے ہو گے۔۔۔''

امیر بخش کو ایسے لگ رہا تھا جیسے اس سے کوئی بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو۔ اس نے موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے نرم رویہ اختیار کیا اور لجاجت سے کہنے لگا ''بھائی صاحب میرا کام'' ہو جائے گا'' کلرک کہنے لگا! ''کوئی میرے اندر پہلے پٹرول ڈالو پھر ہی کام ہو گا نا!'' امیر بخش نے اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے چپڑاسی کو چائے کے

پیسے دیئے۔ کلرک نے مسکراتے ہوئے کہا ''بھائی صاحب! بے فکر ہو جائیں آپ کا کام ہو جائے گا۔''

ابھی دفتر بند ہونے والا ہے آپ پرسوں آ جائیں کیونکہ کل چھٹی ہے۔ امیر بخش نے کہا! ''جب بچے کبھی آنے میں چھٹی نہیں کرتے تو آپ درج کرنے میں کیوں چھٹی کرتے ہیں۔ اس طرح تو مردم شماری کے ساتھ ناانصافی ہے۔''

کلرک غصے میں آ کر بولا ''ارے بھئی میں نے کہا نا کہ آپ کا کام ہو جائے گا آپ تشریف لے جائیں مہربانی ہو گی۔'' ایک بار پھر امیر بخش ہو جائے گا کو کوستا ہوا اپنا سا منہ لے کر گھر واپس آ گیا۔

پھر یوں ہوا کہ کارپوریشن کا دفتر تھا اور امیر بخش تھا اور حرفِ تسلی۔ اسی تکون میں اُلجھے ہوئے پانچ مہینے گزر گئے۔ ان پانچ مہینوں میں جب اس کی فائل اگلے کلرک کی میز تک پہنچی تو وہ اس پر بہت خوش تھا۔ فائل کا سفر بھی ہمارے ملک کی ترقی کی طرح کافی سست تھا۔ دوسرا کلرک ضرورت سے زیادہ ہی سست تھا۔ امیر بخش صبح اُسے سلام کرتا جب واپس آنے لگتا تو وہ اس کے سلام کا جواب دیتا۔ اس طرح چھ ماہ اور اس کلرک کی سستی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ تو خدا کا شکر کہ اس عرصے میں ایک کلرک سے اس کی دوستی ہو گئی اور آخر کار اسے بیٹے کی جنم پرچی مل ہی گئی۔ اس دِن وہ محسوس کر رہا تھا کہ میں واقعی قانونی طور پر باپ بن چکا ہوں اور بالآخر حکومت نے بھی اس امرِ ناگزیر کو تسلیم کر لیا ہے۔

اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ شاید بیٹے کی پیدائش پر بھی نہ ہوا ہو گا۔ وہ خوشی سے چیختا ہوا گھر میں داخل ہوا اور زور سے بولا! ''میں نا کہتا تھا کہ ہو جائے گا۔''

جواباً اس کے ابا جی کی آواز آئی! ''ہو جائے گا نہیں ہو گئے ہیں۔''

امیر بخش گھبرا گیا! ''کیا مطلب۔'' اس کے ابا جی خوشی سے بولے! ''اللہ نے تمہیں چاند سے جڑواں بیٹے دیئے ہیں اور ہاں تم نے شاید ایک سال پہلے بچے کی خوشی میں پھجے حلوائی کو مٹھائی کا کہا تھا وہ بھی آج دے گیا ہے۔'' خوشی سے اس کے ابا کا سانس پھول رہا تھا۔ اسی حالت میں انھوں نے کہا! ''اب ان کے اندراج میں پہلے والی سستی نہ کرنا اور ان کی جنم پرچیوں کا منصوبہ کل سے ہی شروع کر دو اس سے پہلے کہ۔۔۔'' امیر بخش دُکھ اور خوشی دونوں کیفیات اپنے چہرے پر سجائے بولا ''پہلے کا ہو گیا ہے نا! اب اِن کا بھی ''ہو جائے گا!''

○○○

ایئر پورٹ

ہمارے ملک کے بچوں میں یہ خواہش بڑی عام ہے کہ وہ پائلٹ بنیں لیکن وہ وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر خود جہاز بن جاتے ہیں۔ یاد رہے یہ وہ جہاز ہوتے ہیں جو بھاٹی سے اُڑ کر گندے نالے میں جا گرتے ہیں۔ میں ایسے بہت سے جہازوں سے واقف ہوں۔ میں ہوائی جہاز تک تو مالی مسائل کی وجہ سے پہنچ نہیں سکتا البتہ ان جہازوں تک میری رسائی ممکن ہے۔

یہ جہاز بھی آپس میں دُنیا کے ہر موضوع پر گفتگو فرماتے ہیں اور خیالوں میں نا جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات دیکھ کر کوئی بھی ''باہوش'' شخص انھیں باہوش نہیں مانتا مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ خود کو باہوش منوانا بھی نہیں چاہتے اور دُنیا و مافیہا سے بے خبری اور حال کی سرمستی پر ہی سر دُھننا چاہتے ہیں۔

ہمارے کالج کے سامنے ایک جہاز اکثر محوِ پرواز رہتا تھا۔ ایک دِن اُس نے کرائے پر ایک سائیکل لی اور کھڑی سائیکل پر ہی بیٹھ گیا اور اس کے پیڈلوں کو زور زور

سے گھمانا شروع کر دیا اور ٹھیک آدھ گھنٹے بعد سائیکل کا کرایہ دے کر اپنی سمت کی طرف رواں دواں ہو گیا۔

مجھے ان جہازوں کی گفتگو سننے کا بڑا شوق ہے۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میں بڑے مزے سے جا رہا تھا کہ ایک جہاز میرے ساتھ ٹکرا گیا۔ اس نے شاید مجھے بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر سمجھ رکھا تھا۔ میں نے دوسری طرف دیکھا تو ایک اور جہاز اپنے ہاتھ کو کان پر لگا کر شاید اسے فون پر بتا رہا تھا کہ دوسرا جہاز پینٹا گون پر گرانا چاہیے، مجھے ایسا لگتا تھا کہ اس کا تعلق بھی کسی ''جہازی تنظیم'' سے تھا۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ میں بھی ان کے ساتھ چلتا رہا اور آخر کار ان کے ایئر پورٹ تک پہنچ گیا جہاں لاتعداد جہاز پر ہلاتے ہوئے بھنبھنا رہے تھے۔ وہاں تمام جہاز آپس میں گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک جہاز دوسرے سے کہہ رہا تھا! ''سنا ہے اس دفعہ شارجہ کپ جو آسٹریلیا میں ہوا ہے۔ اس میں ہماری ہاکی ٹیم نے دس اوورز میں صرف پانچ گول کیے اور عوام نے ان کی اس بہترین کارکردگی پر انھیں گندے انڈے مارے۔'' دوسرے نے جواب دیا! ''ہاں یار گندے انڈے سے یاد آیا تمھیں پتا ہے کہ انڈے سے بچہ کیسے باہر نکلتا ہے۔''

اس نے جواب دیا ''پاگل مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ وہ اس کے اندر گھستا کیسے ہے۔''

پہلے جہاز نے غصے سے کہا ''بے وقوف تجھے کیا علم کہ سائنس کیا ہوتی ہے تیرے سامنے تو اس کی بات کرنا ایسے ہی ہے جیسے بین کے آگے بھینس بجانا۔''

اس ایئر پورٹ پر اور بھی مختلف کمپنیوں کے بہت سے جہاز جمع تھے۔ کچھ

فلائی کرنا چاہتے تھے اور کچھ اپنے جسم میں سرنجوں سے پٹرول فراہم کر رہے تھے اور شاید پرواز کی تیاری میں مصروف تھے۔

وہاں کچھ جہاز آرام فرما رہے تھے نہ وہ اپنے آپ سے اور نہ کسی اور سے گفتگو فرما رہے تھے۔ وہ بھی کسی سمندر کی طرح خاموش نظر آ رہے تھے جس میں سینکڑوں صدف بے شمار موتیوں کو اُگلنے کے لیے مچل رہے ہوتے ہیں۔

اس ایئر پورٹ پر دو جہاز آپس میں بڑے انہماک سے باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے قریب گیا اور ان کی باتیں غور سے سننے لگا۔

ایک جہاز دوسرے سے کہہ رہا تھا! ''کالے خاں تم رات دھوپ میں مجھے چھوڑ کر خود چلے آئے۔'' تو دوسرے نے جواب دیا! ''جانی تم نے بھی تو ہمیشہ دِن کے اندھیرے میں مجھے اُجالے میں رکھا اور کل تو ویسے بھی میرے دِل میں گردوں کا درد ہو رہا تھا۔'' جانی نے کہا! ''کالے خاں کل میں تمہارے گھر گیا۔ دستک نے میرے ہاتھ کو دیا پھر ایک سفید کپڑوں میں ملبوس شخص باہر نکلا اور کالا سا منہ ہلا کر کہنے لگا! ''کالا گھر پر نہیں ہے۔'' پھر میں سیدھا پی۔ سی ہوٹل گیا۔ وہاں سے کھانا کھایا۔ انھوں نے مجھ سے پیسے مانگے۔ میں نے نہ دیئے تو انھوں نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا تو میں نے پولیس کو پندرہ روپے کا نوٹ دے کر جان چھڑوائی۔'' اس پر کالے خاں بولا! ''جانی تمہیں یاد نہیں کہ کس طرح میری معمولی سی غلطی پر مجھے پی۔ سی ہوٹل سے نکال باہر کیا گیا۔ غلطی محض اتنی سی تھی کہ ایک وی۔ آئی۔ پی مہمان نے مجھے ''گرم مصالحہ'' لانے کے لیے بھیجا تو میں فوراً پنساری کی دُکان پر بھاگا بھاگا پہنچا گرم مصالحہ لیا اور مہمان کو دیا۔ مہمان اور اس کی بیوی جو ویڈیو سیٹ کر رہے تھے اور میرا شدت سے

انتظار کر رہے تھے۔ انھوں نے مصالحہ دیکھا تو سر پکڑ لیا۔ مجھے گالیاں دیں اور کہا کہ!''تمہارے اندر کوئی تہذیب نہیں ہے اور شرم کی بات تو یہ ہے کہ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آتی۔ ہوٹل والوں کو''کلچرڈ'' ملازم رکھنے چاہیے'' پھر اُس نے منیجر کو شکایت کی اور میری چھٹی کروادی۔''

جانی بولا''یار چھوڑ وان باتوں کو چائے ہی پلا دو۔''

کالے خاں نے''جواب'' دیا''میں پہلے ہی''پائی پائی'' کا محتاج ہوں اور لوگ میرے پیچھے پیچھے''واج'' مارتے پھرتے ہیں۔ میں آگے آگے بھاگتا ہوں۔''

جانی نے کہا!''یعنی تم نے کوئی عقل نہ پائی اس کا مطلب ہے تم واج پائی۔''

کالے خاں بولا!''ہاں یار رات میں خبرنامہ دیکھ رہا تھا اس میں واج پائی اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتا ہوا ایک ناری کو ورغلا رہا تھا۔ ناری پسینے میں شرابور گھبرائے ہوئے کہہ رہی تھی!''بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دو بھگوان کے لیے۔'' واج پائی نے اپنی سٹون واش دھوتی سمیٹتے ہوئے کہا!''چھی چھی اتنی پیاری ناری بھگوان کے لیے چھوڑ دوں ایسا میری فطرت میں نہیں۔''

جسونت سنگھ نے ناری کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک ہنومان بھگوان کی طرف سے وارد ہوا اس نے اپنی دُم کے ساتھ اڑتیس بور کا پستول لگا رکھا تھا۔ اُس نے ہنومان کا نعرہ لگایا اور ان کو پستول سے ڈرانے لگا۔ پھر دونوں نے ہنومان کے پاؤں پکڑے اور اِلتجا کر رہے تھے!''بھگوان کے لیے ہمیں چھوڑ دو۔''

ہنومان نے بڑے تکبر سے اپنی دُم کو ہلاتے ہوئے کہا!''بھگوان کو ایسی لت نہیں ہے۔ چلو کنیا بھگوان یاد کر رہے ہیں۔'' جانی نے کہا!''ہندو بڑی مکار اور بزدل

قوم ہے یار ان کی بات ہی چھوڑو وہ گائے کو اپنی ماتا کہتے ہیں اور صبح صبح اس کا ہی دُودھ دوہ کر بیچتے ہیں۔''

پھر کالے خاں نے ایک اینٹ اُٹھا کر کانوں پر لگائی اور کہنے لگا!''یار ایک منٹ ٹھہرو نیویارک سے میری فرینڈ گرل کا فون آیا ہے۔'' جانی سمٹ کر بیٹھ گیا۔

کالے خاں فون سننے لگا!''جی ہاں آواز آ رہی ہے، دھماکہ ہو گیا۔ کہاں؟ ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں۔ گھبرانے والی بات نہیں ہے مائی ڈارلنگ۔ کیا تم واقعی پریشان تھی کہ کہیں میں تو نہیں جا لگا۔ نہیں میرے ماموں کے بیٹے لگے ہیں مائی ڈارلنگ۔ میری اتنی اچھی قسمت کہاں۔ ذرا اُونچا بولو آواز نہیں آ رہی۔ کیا کہا اچھا اچھا، نہیں بُرا بُرا۔ پریشان نہ ہو ذرا چھوٹے بش سے بات کرواؤ جس کے دماغ کے''بش'' ڈھیلے ہو گئے ہیں اور جو مسلمانوں کے تیل کا پیاسا ہے۔ ہاں جی! بش صاحب گھبرانے کی ضرورت نہیں وائٹ ہاؤس میں میرا انتظار کرو میں بس آنے والا ہوں۔ کیا کہا''نہ آؤں پہلے ہی مسئلہ پڑا ہوا ہے۔'' بش صاحب میرے آنے سے مشکلات کم ہوں گی وہ کیا کہا ہے نا! شخص پیر (شیکسپیئر) نے''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔'' کیا کہا''تمہیں تمہارے خاندان کی قسم نہ آؤ۔'' نہیں بش صاحب مجھے ضرور آنا ہے۔''

پھر کالے خاں نے فون بند کر دیا۔ جانی نے کہا کہ''یہ تمہاری''پسند'' کی''انتہا'' ہے کہ تم ایسا سوچتے ہو۔''

کالے خاں نے جواب دیا!''پاگل آدمی یہ''انتہا پسندی'' نہیں ہے۔ ہمیں مسلمانوں اور حق سچ کے لیے تیل پسینہ ایک کرنا ہوگا۔ اب ہمیں ظلم، ناانصافی اور باطل سے ٹکرانا ہوگا۔ ویسے بھی ہم اپنے ملک پر بوجھ ہیں اور اپنی دھرتی ماں کے سینے پر چلتی

پھرتی زندہ لاشیں ہیں۔ ہمیں کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جس سے ہماری آخرت سنور جائے۔''

پھر دونوں جہاز اُٹھے اور مخالف سمتوں میں فلائی کر گئے۔ آج انھوں نے بغیر کسی نشے کے فلائی کیا تھا۔ آج ان کو جو نشہ تھا وہ ایک مقدس نشہ تھا۔ ان کے فلائی کر جانے کے بعد پھر میں اپنے آپ کو اور دوسرے لوگوں کو بھی دھرتی پر ایک بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ اب جیسے ہم بھی اسی ایئرپورٹ کے جہاز ہیں لیکن ہمیں اس بات کی خبر نہیں۔

○○○

Bed Tea

زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ میں سیالکوٹ میں مقیم اپنے دوست سے ملنے گیا۔ رات کا ایک بجا تھا خالی رستہ بول رہا تھا، کہ اچانک میرا دوست مجھے رستے میں ہی مِل گیا۔ خیر و عافیت دریافت کرنے کے بعد وہ مجھے اپنے فلیٹ پر لے گیا۔ میری طبیعت خاصی خراب تھی لہٰذا جلدی سو گیا۔ صبح جلدی اُٹھا اور اُٹھتے ہی ''بیڈ ٹی'' سے میرا واسطہ یوں پڑا کہ موصوف خود بھی نیم درازی کی کیفیت میں بیڈ ٹی نوش فرما رہے تھے۔

میرے استفسار پر انھوں نے فرمایا کہ میاں یہ بیڈ ٹی ہے۔ ٹی یعنی چائے کی کئی اقسام سے تو میں ایک عرصے سے واقف تھا مگر یہ بیڈ ٹی میرے لیے ایک انوکھی اصطلاح تھی۔

چائے کی افادیت و اہمیت کا تو میں روزِ اوّل سے قائل رہا ہوں۔ حضرت مولانا ظفر علی خاں ایک دفعہ اس کی شان میں یوں مدح سرا ہوئے تھے۔

زندگانی کے لطف دو ہی تو ہیں
صبح کی چائے ، شام کا حقہ

زندگی کے تو صرف شاید دو ہی لطف ہوں مگر چائے کے بہت سے ذائقے ہوتے ہیں اور اس کی کئی اقسام ہیں، جیسے سبز چائے، پہلے میرا سبز چائے کے بارے میں خیال تھا کہ سبز چائے سے مراد ایسی چائے جو کسی کو سبز باغ دِکھا کر پلائی جائے اور جو شاید یہاں ہر کسی کو صبح و شام زبردستی پلائی جاتی ہے اسے سبز چائے کہتے ہیں۔

چاکلیٹ سے مراد وہ چائے ہے جس میں چاک ڈال کر مہمان کو خواہ مخواہ لیٹ کیا جائے اور پشاوری چائے سے مراد ایسی چائے جو پشاور میں ہی بوئی، کاٹی اور پلائی جاتی ہے۔

بالآخر بیڈ ٹی کے بارے میں مجھے علم ہوا کہ بیڈ ٹی سے مراد ایسی چائے جو بغیر ہاتھ منہ دھوے امرا بیڈ پر ہی نوش فرماتے ہیں اور یوں اگر اس بیڈ ٹی کو ''بیڈ''، ''ٹی'' (Bad Tea) بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یاد رہے کہ یہ بیڈ ٹی اس وقت تک بیڈ ٹی ہے جب تک یہ بیڈ پر ملے۔ منہ ہاتھ دھونا بیڈ ٹی کے منافی ہے بلکہ گناہ ہے کیونکہ پھر اس کی اصل شرط پوری نہیں ہوتی۔ ویسے بھی آرام طلب امرا کی زیادہ تر سرگرمیاں بیڈ پر ہی سرانجام پاتی ہیں حتیٰ کہ وہ چائے بھی بیڈ پر ہی پینا پسند کرتے ہیں۔ جسے انھوں نے اپنی سہولت کے لیے اور اپنی ہڈ حرامی کو چھپانے کے لیے بیڈ ٹی کا نام دے رکھا ہے۔

غربا اس چائے سے لطف نہیں اُٹھا سکتے کیونکہ ان کا پہلا کام صبح صبح نہانا ہوتا ہے اور اس طرح یہ فعل ہی یعنی نہانے کا بیڈ ٹی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ دوسرا

مسئلہ ان کے لیے یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے پاس اعلیٰ قسم کا بیڈ تو ہوتا نہیں بلکہ ''منجی'' (چارپائی) ہوتی ہے۔ اگر وہ بغیر منہ ہاتھ دھوئے اس پر چائے پی ہی لیں تو یہ بیڈ ٹی تو نہ ہوئی بلکہ یہ تو منجی ٹی ہوئی۔

امیر لوگ جتنے اخراجات بیڈ ٹی پر کرتے ہیں غربا کی اتنی شاید آمدن بھی نہیں ہوتی۔ ابھی یہ صرف ان کے بیڈ ٹی کے اخراجات ہیں اور بیڈ کے خدا جانے کتنے اخراجات اور لوازمات ہوں گے۔

ہماری قوم بھی چائے کی بڑی شوقین ہے۔ چائے ایسے پیتے ہیں جیسے یہ غصہ پیتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست فرما رہے تھے کہ سگریٹ اور چائے زیادہ پینے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ بندہ بوڑھا نہیں ہوتا کیونکہ وہ جوانی میں ہی مر جاتا ہے۔ یہاں اگر کسی کو کوئی روزگار نہ ملے وہ چائے بنانا شروع کر دیتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ چائے صرف ایک دفعہ ہی خریدتا ہے اور پھر ساری عمر اسی چائے سے ہمیشہ چائے بناتا ہے۔ پھر بھی یہ کام کوئی زیادہ سودمند نہیں ہے کیونکہ چائے بنانے والے کی ساری عمر میٹھا کم اور زیادہ کرنے میں ہی بسر ہو جاتی ہے۔ اس طرح یہ چائے بنانے والے لوگوں کے جسم کو دیکھ کر ہی بتا دیتے ہیں کہ اس کو شوگر ہے یا نہیں بلکہ ایک دفعہ تو ایک چائے بنانے والے نے ایک چھوٹے سے بچے کا منہ پیار سے چوما اور اسے کچھ اس میں مٹھاس محسوس ہوئی تو اس نے وہیں بتا دیا کہ اس کی ماں کو شوگر ہے۔ اس طرح یہ لوگ ڈاکٹری کا پیشہ بھی سرانجام دیتے ہیں اور بغیر لیبارٹری ٹیسٹ کے لوگوں کو شوگر کے بارے میں بتاتے ہیں۔ یہ چائے بنانے والے بہت چالاک ہوتے ہیں۔ آج کل تو انھوں نے چائے کو مختلف اقسام میں منقسم کر دیا ہے۔ سب سے پہلے یہ گاہک

سے پوچھتے ہیں کہ آپ فرسٹ کلاس، سیکنڈ کلاس یا ''رزرو'' چائے پئیں گے۔ مجھے مذکورہ پہلی دو اقسام کا تو علم تھا لیکن رزرو چائے کا علم بعد میں ہوا کہ یہ چائے کی وہ قسم ہے جو سخی لوگ چائے پیتے ہوئے کپ میں ایک دو گھونٹ چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اس کو بھی ضائع ہونے سے بچا لیتے ہیں یعنی جب مختلف ذائقوں سے بھرپور اس کا ایک کپ تیار ہو جاتا ہے تو یہ اس کو بصد احترام گاہک کے سامنے پیش کرتے ہیں اور کم پیسے وصول کر کے اپنی مفت میں شہرت کرواتے ہیں۔ یوں یہ باہر بڑا کر کے لکھ دیتے ہیں کہ یہ پیشکش محدود مدت کے لیے ہے۔

چائے کی ایک اور سب سے مشہور اور عام قسم چائے پانی ہے۔ جس سے ہر عقل مند شخص واقف ہے کیونکہ ہمارے معاشرے میں یہ کثرت سے پی اور پلائی جاتی ہے۔ یہ زیادہ تر سرکاری دفاتر میں پائی جاتی ہے۔ چائے پانی کا رشتہ بالآخر بیڈ ٹی سے جا ملتا ہے کیونکہ چائے پانی اور بیڈ ٹی ''ظالم و مظلوم'' ہیں۔ جو شخص چائے پانی کا رسیا ہوتا ہے وہ بیڈ ٹی کا بھی عادی ہوتا ہے کیونکہ اس کے سٹیٹس کو برقرار رکھنے کے لیے یہ اہم کام سرانجام دیتی ہے۔

چائے کا ایک کزن بھی ہوتا ہے جسے قہوہ کہتے ہیں۔ قہوے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو دُودھ بالکل ایسے نصیب نہیں ہوتا جیسے آج کل کے شیر خوار بچوں کو فطری دُودھ۔

چائے کی ایک رشتہ دار ''کافی'' ہوتی ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ چائے کا رنگ ایسے ہوتا ہے جیسے پاکستانی لوگوں کا اور کافی کا ایسے جیسے ویسٹ انڈیز کے لوگوں کا۔ کافی بھی زیادہ تر امیر طبقہ ہی پیتا ہے کیونکہ غرباء کے لیے تو بلھے شاہ کی ''کافی'' ہی کافی ہے جبکہ امراء کے لیے یہ کافی ناکافی ہے۔